افسانوی مجموعہ

آدھے اُدھورے لوگ



ڈاکٹر محمد شفیع ایاز

آدھے ادھورے لوگ

افسانوی مجموعہ

ڈاکٹر محمد شفیع ایاز

☆ نامِ کتاب: آدھے ادھورے لوگ

☆ مصنف: ڈاکٹر محمد شفیع ایازؔ

☆ سنہ اشاعت: ۲۰۲۰ء

☆ قیمت: Rs 350/-

☆ طباعت: المختار پبلی کیشنز انت ناگ کشمیر

کتاب ملنے کا پتہ:

☆ کتاب گھر: لال چوک

☆ جہلم ویلی کلچرل سوسائٹی، فیضان بلڈنگ کھنہ بل انت ناگ

☆ ڈاکٹر محمد شفیع ایاز: اقبال آباد کے پی روڈ

اسلام آباد (انت ناگ (کشمیر)

فون نمبر: 7006594340 : 94190 40604

اِنتساب

اُس ارضِ وطن کے نام

جہاں

سرخ پھولوں سے لہُو پھوٹ رہا ہے



☆☆ کل کس نے تمہیں مجروح کیا، مت بولو لیکن اُس ماضی کو بھول جاؤ جو تمہیں پریشان کرتا ہے۔

حال کی طرف مرکوز ہو جاؤ جو تمہیں خوشی دے گا۔

ہماری زندگی میں بہت سارے رشتے سمندر پر بارش کی طرح آتے ہیں مگر ان میں کچھ ہی فائدہ مند ہوتے ہیں

جیسے ایک قطرہ لعل بھی بن جاتا ہے۔

خدا بہترین سُننے والا ہے اور وہ خاموش دل کی خاموش ندا سنتا ہے۔

آپ پریشان مت ہو جایئے۔

اس میں بھی اللہ کی طرف سے اچھائی ہوگی



اپنی بات

پہلے سے شائع شدہ تین افسانوی مجموعوں ''دردِ پنہاں'' ''پگڈنڈی کا مسافر'' اور ''فیصلہ ابھی باقی ہے'' کے بعد میرا یہ چوتھا اردو افسانوں کا مجموعہ پیشِ خدمت ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں اُس سماج کے اثرات واضح طور نُمایاں ہوتے ہیں جس سماج میں وہ رہتا ہے۔ ویسے فرد سے سماج اور سماج سے فرد، کائناتی حقیقت ہے۔ ادیب یا شاعر سماج کا حساس ترین فرد ہوتا ہے اور اسکی تیسری آنکھ ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ چونکہ میں اُس خطہ سے تعلق رکھتا ہوں جو کئی دہائیوں سے ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہے۔ جنت برزمین کہلانے والا یہ خطہ ارض جہنم بن کے رہ گیا ہے۔ میرے اِس افسانوی مجموعہ ''آدھے ادھورے لوگ'' میں بیشتر افسانے ان ہی حالات و واقعات کی عکاسی کرتے ہیں جن سے میرا ارض

وطن گزر رہا ہے۔ اگر چہ ان افسانوں کے تمام کردار فرضی ہیں لیکن کہانیاں فرضی نہیں۔ میری یہ تحریر تلخ ہو سکتی ہے لیکن مبنی بر صداقت ہے۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا لوگوں کی کہانی جو انتہائی نفسیاتی ہیجان کے باعث اضطراب و تذبذب کی حالت میں ہیں۔ میں نے ان ہی لوگوں کے بیچ رہ کر خود ان زخموں کو محسوس کیا ہے۔ میرا افسانوی مجموعہ اسی درد کا اظہار ہے۔

میں نے اس خدشات بھرے ماحول کی عکاسی کے دوران اُن کرداروں کو بھی عریاں کرنے کی کوشش کی ہے جو ابن الوقت ہیں، خود غرض ہیں اور ان حالات سے ناجائز فایدہ اُٹھانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ قارئین نہ صرف ذوقِ ادب کی خاطر میرے افسانے پڑھیں گے بلکہ ان کہانیوں کے دریچوں سے جھانک کر اِس خطہ کے زمینی حالات سے بھی واقف ہونے کی سعی کرینگے۔

یہی میری خواہش ہے اور یہی میری کوشش !!

اقبال آباد، اننت ناگ کشمیر

۲۰۲۰ء

محمد شفیع ایاز

مولوی صاحب

مولوی صاحب کا حلیہ عام مولویوں کی طرح نہیں تھا۔ نہ لمبی چوڑی داڑھی، نہ منڈی ہوئی مونچھیں، نہ ماتھے پر سجدے کا کالا نشان، نہ سر منڈا ہوا، نہ سر پر پگڑی یا عمامہ۔ البتہ آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے۔ عمر اگرچہ ستر سے اوپر تھی مگر شکل وصورت سے جوان لگتے تھے۔

ایک بار مغرب کی نماز میں مولوی صاحب نے قرآن شریف کے ایک ایسے سورۃ کی تلاوت کی جو مجھے اتفاقاً یاد تھا۔ سچ مانو تو مجھے کلام اللہ کے صرف دس بیس چھوٹی موٹی سورتیں ہی زبانی یاد ہیں۔ اور یہ سورۃ ان میں شامل ہے۔ مولوی صاحب نے تلاوت میں کچھ بھول کی اور میں نے فتح دیدی لیکن مولوی صاحب نے اَن سُنی کر دی۔ نماز ادا کرنے کے بعد مولوی

صاحب نے مجھے اشارتاً ٹھہرنے کو کہا۔ سب نمازی جب مسجد سے نکلے تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''برخوردار۔ آج تم نے نماز کے دوران فتح دی۔ ایسا آئندہ کبھی نہیں کرنا۔ فتح وہی دے سکتا ہے جو امام سے زیادہ عالم اور جاننے والا ہو لہٰذا آئندہ ہوشیار رہنا، ایسی غلطی دوبارہ نہ کرنا''

میں بلاشُبہ نہ کوئی عالم اور نہ کوئی حافظ ہوں لہذا میں خاموش رہا۔ لیکن اس بات سے میں واقف تھا کہ مولوی صاحب نے سب مقتدیوں پر یہ باور کیا کہ وہ حافظ قرآن ہیں۔ اب وہ حافظ تھے یا نہیں میری نظروں میں یہ بات ہی مشکوک تھی اور بعد میں میرا یہ شک یقین میں تبدیل ہوا لیکن یہ سوچ کے کہ مولوی صاحب مسجد کے امام ہیں، قابل احترام ہیں۔ میں نے چپ سادھ لی اور کسی سے اس بات کا ذکر بھی نہ کیا۔

مولوی صاحب وعظ خوانی اور تبلیغ بڑے غضبناک طریقے سے کرتے۔ وہ سمجھاتے نہیں بلکہ ڈراتے تھے۔ کس کی مجال کہ کوئی کچھ کہتا۔ دراصل مولوی صاحب خاندانی مولوی تھے اور ان کے والد، دادا، پردادا سب مولوی رہے تھے اور اسی مسجد میں امامت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ بات بات پر ٹوکنا، یہ لباس صحیح نہیں، وضو اچھی طرح نہیں کیا، سر پر

ٹوپی نہیں رکھی ہے، پیر ایسے ویسے رکھے ہیں ، طریقہ نماز درست نہیں .... روز کسی نہ کسی مقتدی کو ڈانٹ پلاتے اور پھر کہتے کہ تمہاری تمام نمازیں مکروہ تحریمی ہیں یعنی نئ ادا کرنی ہیں۔ میں اس قسم کے فتویٰ سے بچنے کیلیئے اکثر پچھلی صف میں شامل ہوتا تھا تا کہ مولوی صاحب کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ دراصل مولوی صاحب کا خیال تھا کہ کوئی بھی غلط چیز یا غلط عمل ڈرانے سے روکی جاسکتی ہے۔ جبکہ میرا ماننا یہ تھا کہ خیالات اور عقائد سے انسانی اعمال کا تعلق ہے۔ مگر مولوی صاحب کے سامنے سچ بولنے سے نہ جانے مجھے کون سا خوف روک رہا تھا۔

علاقے میں ان دنوں بڑے پیر صاحب کا عرس تھا اور عرس کے تین ایام کے دوران علاقے کے لوگ گوشت، مرغا، مچھلی وغیرہ نہیں کھاتے تھے۔ سُنا تھا کہ بڑے پیر صاحب نے کبھی بھی عمر بھر یہ چیزیں نہیں کھائی تھیں۔ اور یہ ترک لذت انکی عبادات کا حصّہ تھا۔ ہمارے مولوی صاحب بڑے پیر صاحب کی درگاہ کے مجاور بھی تھے اور انہیں اس درگاہ سے خاص لگاؤ اور اعتقاد تھا۔ اس درگاہ میں سبھی مذاہب کے لوگ حاضری دیتے تھے اور عقیدتاً گوشت، مرغی، مچھلی کھانے سے اُن دنوں پرہیز کرتے تھے اور سنُنے میں یہ بھی آیا تھا کہ اگر کبھی کسی نے اس پیر صاحب کے عرس کے

دوران یہ چیزیں کھائیں اُسے بُرے دنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بد قسمتی سے ان ہی عرس کے ایام میں میری صحت خراب ہوگئی اور مجھے علاقے کے ایک مشہور معالج کے پاس جانا پڑا۔

''ڈاکٹر صاحب، دو چار دن سے طبیعت خراب ہے۔ بخار ہے اور زبردست قسم کی کھانسی ہے''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل آجکل موسم ہی کچھ ایسا ہے اور تو اور یہ روسی سفیدوں سے جو روئی کی شکل کا پولن آجکل گرتا ہے وہ بھی کھانسی وغیرہ کا موجب ہے۔ کیا کریں لوگ یہ جان کر بھی کہ یہ سفیدے مضر صحت ہیں پھر بھی لگاتے رہتے ہیں۔ خیر میں پولن کو روک نہیں سکتا لیکن تمہارا علاج کرتا ہوں۔ یہ دو قسم کی گولیاں صبح شام لے لینا اور یہ دوائی کی بوتل سے دو چمچ دن میں تین بار لینا۔ کھانا مٹن سوپ یا چکن سوپ کے ساتھ کھالینا''

''لیکن ڈاکٹر صاحب۔ آجکل بڑے پیر کے عرس کے دن ہیں۔ میں کیسے مٹن یا چکن سوپ لے سکتا ہوں۔ یہ تو گناہ ہے''

ڈاکٹر صاحب ہنسے اور کہنے لگے۔

''بھائی صاحب۔ یہ گناہ نہیں ہے۔ کوئی حلال چیز حرام نہیں

ہوسکتی۔ رہی احترام کی بات.....وہ کچھ اور ہے۔ احترام میں آپ نہ کھائیں تو کوئی گناہ بھی نہیں۔ لیکن اس وقت آپ بیمار ہیں لہٰذا کھانے میں کوئی حرج نہیں''

''نہیں ڈاکٹر صاحب ۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ اگر ایسا کیا تو خدانخواستہ معلوم نہیں آگے کونسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑیگا۔'' میں نے بڑے حلیمانہ انداز میں کہا

''بھئی کیوں؟ یہ وہم ہے۔ اپنے مولوی صاحب کو جانتے ہو۔ وہ اِس درگاہ کے مجاور ہیں۔ اور انہیں گوشت، مچھلی اور مرغے کے بغیر کھانا ہضم ہی نہیں ہوتا۔ میرے ہی زیرعلاج ہیں۔ روز گوشت سوپ کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور درگاہ پر حاضری بھی دیتے ہیں۔ انہیں کونسی مصیبت آئی اب تک۔ اچھا خاصا گھر، ان کے بچے اچھی نوکریاں کرتے ہیں۔ شاندار مکان زمین زراعت اور خوب پیسہ.......... بڑے پیر صاحب ظالم نہیں تھے اور نہ اُنہوں نے کسی سے زبردستی کی ہے۔ وہ خدا کے پیارے اور مقبول بندے تھے اور ہمیشہ ان کی عبادت اور خدمت خلق اللہ کرتے تھے۔ اللہ ہمیں انکے دِکھائے ہوئے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے...........آپ جائیے اور گھر پر آرام کیجئے، یہ وہم اور توہم پرستی چھوڑ دیجئے۔''

ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے میرے اعتقاد میں کوئی فرق نہیں پڑا مگر مولوی صاحب کے بارے میں نیا انکشاف سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

ہمیں وعظ و نصیحت اور خود..........

ایک روز مسجد میں نوجوان نسل کی بگڑتی عادتوں پر لمبی تقریر میں کہا کہ ''تیرے نام'' کی وبائی بیماری آجکل نوجوانوں میں پھیلی ہے۔ میں سوچتا رہا کہ یہ ''تیرے نام'' کی بیماری کیا ہے؟ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دراصل مولوی صاحب نے رات کو ٹیلی ویژن پر ''تیرے نام'' کی فلم دیکھی تھی جس میں ہیرو کے بالوں کا ایک خاص سٹائل تھا جو اب نوجوانوں میں عام ہو چکا تھا اور اسی کی مناسبت یہ انکی تقریر تھی۔

چونکہ روزوں کے مہینے میں مسجد میں سبھی گمشدہ نمازی نظر آتے ہیں اور بڑی بھیڑ رہتی ہے ان ایام میں مولوی صاحب بھی بڑی ٹھاٹھ باٹھ سے سج سنور کے مسجد میں نماز پڑھانے آتے تھے۔ حسب عادت ان ایام میں مسجدوں میں مختلف فقہی مسائل اور دیگر غیر اہم باتوں پر بحث و تکرار ہوتی رہتی ہے اور مولوی صاحب ان باتوں کا خاص خیال رکھتے۔ کیا مجال کوئی ان کے سامنے یہ بحث چھیڑ دے۔ ویسے علاقے میں دینی مسائل اور قرآن وسنت سے کوئی بھی شخص اچھی خاصی واقفیت یا جانکاری نہیں رکھتا تھا اور امام

صاحب ۔ وہ تو بقول انکے بڑے عالم ، فاضل ، حافظ ، قاری ، مُدرس ، واعظ ، مفتی وغیرہ وغیرہ سب تھے ۔ اور اکثر لوگوں بلکہ قریباً سبھی لوگوں کو اس بات کا یقین بھی تھا ۔ اندھوں میں کانا راجا ۔ لیکن داد دینی پڑے گی اس بات کی کہ مولوی صاحب نڈر اور بے خوف تھے ۔ کسی بات کی بھی پرواہ نہیں کرتے ۔ لوگ چاہے کیا کہیں انکو اُسے مطلب نہیں ، اپنے کام سے کام ۔ ویسے مولوی صاحب کا کام ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور کی طرح تھا ۔ جس طرح ڈیپارٹمنٹل سٹور میں آپ کو اے ٹو زیڈ سبھی چیزیں ملتی ہیں اسی طرح مولوی صاحب کے پاس بہت سی چیزوں کا حل اور علاج تھا ۔ وہ امامت بھی کرتے تھے ، بچوں کو قرآنی تعلیم دیتے تھے ۔ نکاح خوانی اور فاتحہ خوانی خاندانی پیشہ تھا ، بیماری اور بھوت پریت سے نجات کے لئے تعویز دیتے تھے ، گھر سے بھاگے ہوئے لڑکی اور لڑکے کا نکاح پڑھتے ، فتویٰ جاری کرتے ، وعظ و تبلیغ کرتے ، درگاہ میں مجاور کا کام کرتے وہاں موجود تبرکات کی زیارت کرواتے اور بھی بہت سارے کام ۔

عورتوں کو وعظ خوانی کے ذریعے مخاطب کرنے میں انکو کمال حاصل تھا ۔ جب بھی خواتین انکا وعظ و تبلیغ سنکر آتیں تو کم از کم دو چار دن تک وہ مسلسل نماز پڑھتیں ، پردہ رکھتیں ، کسی کی غیبت نہیں کرتیں اور اپنے

شوہروں کی خوب خدمت کرتیں۔ یہ اثر انکے وعظ و نصیحت کا کم اور اُنکے ڈرانے کا زیادہ ہوتا تھا کیونکہ کہ وہ خواتین کو حسب عادت عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے۔

''بے پردہ عورت کو سر کے بالوں کے ذریعے جہنم میں لٹکایا جائیگا اوراس کا دماغ ہنڈیا کی طرح پک رہا ہوگا۔ زبان دراز عورت زبان کے بل لٹکائی جائیگی۔ ناجائز تعلقات رکھنے والی عورت اسی طرح چھاتیوں کے بل لٹکے گی۔ چغل خور عورت کا چہرہ خنزیر کی طرح اور باقی جسم گدھے کی طرح ہوگا اور سانپ اسکو لپیٹے ہونگے۔ لپ سٹک لگانا، ناخن پالش لگانا، دیر سے سونا، ناپاک رہنا، غیبت کرنا، جھوٹی قسم کھانا۔ انکا ارتکاب کرنے والی عورت پر عذاب قبر یقینی ہے اور وہ وارِدِ جہنم ہوگی۔'' اور اس کے بعد وہ رحمت قدرت بیان کرتے تھے۔

''جو عورت شرم و حیا کا دامن تھام کر رہے گی، جو والدین کی فرمانبردار رہے گی، اپنے خاوند کی خدمت گذار رہے گی اور صوم وصلواۃ کی پابند رہے گی وہ جنت میں داخل ہوگی۔ مرنے کے بعد اسے موتی کا محل ملے گا۔ ستر حوریں پاؤں دبائیں گی اور ملکہ کی طرح رہے گی''۔

گویا مولوی صاحب کی شخصیت ایک منفرد شخصیت تھی جس میں

بہت خصائل موجود تھے۔

میلاد کے دن تھے، ان دنوں مولوی صاحب کی مصروفیات کچھ زیادہ ہوتی تھیں روزمرہ مشغولیات کے علاوہ جلسے جلوس اور پھر شبانہ محفل میلاد میں شرکت اور قیادت کرنا ان دنوں کا معمول تھا۔ مولوی صاحب بڑے خوش وخرم اور جوش اور شوق کے ساتھ اِن دنوں تمام محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ صاف و شفاف کپڑے پہنے ہوئے، عطر اور سرمہ لگا کے ہاتھوں میں تسبیح۔ کیا انداز۔ چہرے پر رونق اور ہونٹوں پر مسکان.......... میں بھی ان محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ اور رات دیر گئے وہاں سے واپس آتا تھا۔

ان ہی ایام میں اک روز صبح سویرے جب میں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ علاقے میں دو چار جگہوں پر کچھ لوگ کانا پھوسی کر رہے تھے، چونکہ مجھے دفتر جانے کی جلدی تھی اسلئے میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ شام کو میں واپس گھر آیا مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کیلئے گیا تو دیکھا کہ مولوں صاحب موجود نہیں۔ اور نہ ہی کوئی مقتدی، میں حیران ہو گیا کہ آخر بات کیا ہے۔ پھر خیال آیا کہ مولود کے ایام میں شاید کہیں کسی جگہ محفل میلاد کا اہتمام ہو گا اور سبھی لوگ وہیں گئے ہونگے اور لازماً مولوی صاحب بھی

وہیں ہونگے۔ مسجد سے باہر نکلا تو رحیم بھائی ملا۔

''رحیم بھائی۔ ٹھہرو ذرا'' میں نے اُسے آواز دی

رحیم ٹھہر گیا اور بولا، ''کیا بات ہے بھئی؟''

''بھئی مسجد میں کوئی نہیں ہے کیا کہیں محفل میلاد ہے؟ کہاں ہے آج محفل؟'' میں نے پوچھا۔

رحیم نے میری طرف نظر ڈالی اور آہ بھر کر کہا!

''تم نے سُنا نہیں۔ مولوی صاحب سخت بیمار ہیں اور سبھی لوگ انکی عیادت کرنے ان کے گھر گئے ہیں'' رحیم نے جواب دیا۔

میں سیدھے مولوی صاحب کے گھر گیا۔ وہ بستر پر لیٹے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور زبان جواب دے چکی تھی۔ گھر والے بڑے اُداس تھے اور علاقے کے بہت سارے لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر نے بھی قریباً جواب دیا تھا۔

''یہ کیسے ہوا'' میں نے پوچھا

''اچانک دن میں جب وہ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد آ گئے تو گھر میں کسی نے کوئی بات سُنائی بس ایک دم دھڑام سے گر پڑے۔ شکر ہے کہ کریم صوفی انکے ساتھ انکے گھر آیا تھا۔ ورنہ شاید کسی کو معلوم نہیں پڑتا۔''

کسی نے کہا

میں مولوی صاحب کے گھر سے نکلا تو مجھے ایسا لگا کہ مولوی صاحب اب چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ محلے کے سبھی لوگ مولوی صاحب کی صحت یابی کیلیئے دعائیں مانگ رہے تھے۔

گھر پہنچ کر میں نے جونہی چائے پینی شروع کی کہ مسجد کے لاوڈ سپیکر سے مولوی صاحب کے انتقال کا اعلان ہوا۔ میں نے چائے کا پیالہ ایسے ہی چھوڑا اور فوراً مولوی صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا جہاں پہلے سے ہی کافی لوگ موجود تھے جن کی آنکھیں پُرنم تھی۔

مولوی صاحب کی وفات کے بعد اس خاندان میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو صحیح معنوں میں ان کا دینی اور خاندانی پیشے کا وارث بننے کے مستحق تھا۔ کیونکہ ان کے سبھی لڑکے اس موروثی پیشے کو کب کا الوداع کر چکے تھے۔ اور سرکاری ملازمت اختیار کر چکے تھے۔ اس وجہ سے بھی پورا گاؤں اب اس خاندان کی دینی رہنمائی سے محروم ہورہا تھا۔

قریباً تین گھنٹوں کے بعد مولوی صاحب کا جنازہ بڑے پیر کے درگاہ کے احاطے کی طرف روانہ ہوا۔ میں بھی جنازے کے پیچھے پیچھے تھا۔ اور اسی دوران پیچھے سے کسی نے میرا ہاتھ پکڑا، دیکھا تو میرا ایک قریبی

ہمسایہ تھا۔ جو شہر کے ایک تھانے میں متعین تھا۔ اُس نے دبے لہجے میں پوچھا۔

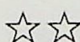
''مولوی صاحب کی وفات کب ہوئی؟''

ابھی تین چار گھنٹے پہلے، سُنا ہے نماز ظہر کے بعد، جب گھر آئے تو کسی نے فون پہ کوئی بات سنائی اور اسی دم وہ بے ہوش ہوئے تھے۔ اور بعد میں انتقال کر گئے۔'' میں نے کہا۔

''بڑا نیک تھا مولوی صاحب تبھی برداشت نہ کر سکا ہوگا۔''

''برداشت .... میں نہیں سمجھا''

''بھئی تمہیں معلوم نہیں کل شام مولوی صاحب کی چھوٹی بیٹی جو شہر میں پڑھتی ہے کسی بیرون ریاست شخص کے ساتھ بھاگ گئی اور یہ بات میں نے ہی مولوی صاحب کو آج فون پر بتائی تھی۔



بے سمت زندگی

جاوید جب کیفے میں داخل ہوا تو وہاں بیٹھے ہوئے سبھی ساتھیوں نے اُسے مبارکباد دی۔ پورے چار سال بعد اِس دور دراز چھوٹے سے قصبے سے اسکی تبدیلی اپنے شہر میں ہوئی تھی۔ کلدیپ، سُریش، ریاض اور پٹھانیا سب نے اس ٹرانسفر آرڈر کے بارے میں دن کو ہی سُنا تھا اور جب حسب معمول وہ شام کو کیفے میں آئے تو جاوید سے مل کر اُس کو مبارکباد دینے لگے۔ کیوں کہ یہاں سے ٹرانسفر ہونا بڑی خوش قسمتی سمجھی جاتی کیوں کہ جو بھی کوئی اس علاقے میں تبدیل ہو کر آتا وہ اِسے سزا سمجھتا تھا اور جوئن کرنے کے دن سے ہی اس انتظار میں رہتا کہ کب اسکا واپسی کا حُکم نامہ جاری ہوگا۔

کلدیپ، سریش، ریاض، پٹھانیا اور جاوید پانچوں یہاں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ ان کی ٹرانسفر بھی دو چار سال پہلے اس علاقے میں ہوئی تھی۔ سریش اور جاوید نوجوان تھے اور ریاض، کلدیپ اور پٹھانیا اُن سے

عمر میں بڑے تھے۔ اگر چہ وہ مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے اور یہاں آنے سے پہلے ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے، لیکن یہاں آکر پہلے ہی سال میں وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے جیسے اُنکی پہلے سے ہی جان پہچان تھی۔ کیفے والا وِپل انکو پنج پیارے کے نام سے پکارتا تھا۔ اس علاقے میں ایسا کوئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں کچھ وقت گذارا جاتا، ایک دو پبلک پارکیں تھیں مگر انکی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دن بھر آفس کا کام کر کے تھکے ماندے پانچوں ساتھی جب اپنے اپنے کمروں میں جاتے تو چینج کر کے اِسی کیفے میں پہنچتے۔ اگر چہ سبھی نے رہنے کیلئے علیٰحدہ علیٰحدہ کمرے لئے تھے، لیکن شام کو ضرور ایک ہی جگہ مل کر گپ شپ لگاتے جس سے اُنکی دن کی تھکان اور گھر سے دُوری کی فکر دور ہو جاتی تھی۔ ویسے یہ کیفے دراصل کوئی کیفے نہیں تھا بلکہ ایک مقامی نوجوان وِپل کی ایک چھوٹی سی دُکان تھی جہاں وہ موبائیل فون چارج کرنے کا کام کرتا تھا۔ اسکے پاس ایک کمپیوٹر تھا جو لینڈ لائن براڈ بینڈ نیٹ سے جڑا تھا لیکن اکثر یہ براڈ بینڈ آوٹ آف آرڈر رہوتا تھا۔ اِسی دکان میں اندر بیٹھنے کی جگہ تھی جہاں پانچ چھ پلاسٹک کی کرسیاں لگی تھیں اور اُن پر ہی بیٹھ کر پانچوں یار گپ لگاتے تھے۔ اس دکان کو کیفے کا نام سریش نے دیا تھا۔ اب یہ جگہ کیفے نام سے ہی جانی

جاتی تھی۔ کون کہاں کا رہنے والا ہے یہ سب کو معلوم تھا۔ وہ ایکدوسرے کے گھر کے حالات اور گھریلو زندگی کے بارے میں جانتے تھے ماسوائے جاوید کے جس نے کبھی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور پوچھنے پر ہنسی مذاق میں ٹال دیتا تھا۔ پانچوں ساتھی ایکدوسرے کو سر کہکر پکارتے۔ اگرچہ بے تکلفی میں بات کرتے لیکن عزت واحترام سے ایکدوسرے کا نام لیتے۔ خوب ہنسی مذاق کرتے۔ دن میں جس کے ساتھ بھی کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہو یا کوئی خبر سُنی ہو وہ شام کو آکر کیفے میں سبھی کو سُناتا۔ چونکہ اس علاقے میں بجلی آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا کرتی تھی اور اکثر غائب رہتی تھی لہذا سب دوست اپنے اپنے آفِس سے فون چارج کر کے لاتے تھے۔ جب کبھی نٹ چلتا تب وٹس اَپ پر آئی ہوئی مسیج یا امیج ایکدوسرے سے شیئر کرتے اور پھر اس پر خوب چرچا کرتے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی اپنے ساتھ بسکٹ، کولڈ ڈرنگ یا سموسے ضرور لے آتا جو وہاں گپ شپ کے دوران کھایا کرتے تھے۔ جہاں تک روز کھانے پینے کی بات تھی، پٹھانیا کے بغیر باقی چاروں ساتھی خود روٹی سبزی پکاتے تھے اور کھاتے لیکن پٹھانیا علاقے میں قائم ایک آرمی کیمپ کے میس سے ٹفن لیتا تھا۔ اسکا کہنا تھا کہ معمولی رقم کے عوض اسے بریک فاسٹ، لنچ اور ڈنر بغیر کسی پریشانی کے ملتا ہے۔ ویسے کچھ اور لوگ جو

اس علاقے میں نوکری کرتے تھے اِسی میس سے ٹفن لیتے تھے۔ مگر دیگر چار ساتھی اُنہوں نے نہ کبھی اس کے بارے میں سوچا تھا اور نہ اسمیں کبھی کوئی دلچسپی دکھائی تھی۔

آج جب جاوید کا ٹرانسفر آرڈر آ گیا تھا تو سبھی ساتھی خوش بھی تھے اور تھوڑے مایوس بھی۔ خوشی اس بات کی کہ جاوید واپس اپنے گھر جا رہا تھا اور مایوسی اس لئے کہ انکا ایک ساتھی اُن سے جُدا ہو رہا تھا۔ خیر دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ جب بھی اس علاقے سے واپس گھر کسی کی ٹرانسفر ہوتی تھی تو وہ عید منا لیتا اور ساتھ ہی وہ جانے کے بعد کبھی بھی اس علاقے کی جانب منہ نہیں کرتا جیسے اُسے جیل سے رہائی ملی ہو۔ ویسے بھی جو لوگ اس علاقے میں بسلسلہ ملازمت آتے وہ ہمیشہ پریشان ہی رہتے، گھر کی پریشانی بچوں کی فکر، تنہائی یہ سب اسکا سکون چھین لیتی۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی اس علاقے میں کوئی بھی اپنے بال بچوں کو ساتھ نہیں رکھ سکتا کیونکہ علاقہ میں کسی قسم کی سہولیات نہیں۔ بجلی غائب، پانی گندہ، کھانے پینے کی چیزیں خراب لیکن مہنگی، نہ کوئی اچھا سا مارکیٹ، نہ سینما، نہ کوئی تفریح۔ زبان بھی مختلف اور کھانے پینے کے عادات بھی۔ دوسری بڑی پریشانی رابطے کی تھی۔ یہ علاقہ دوسرے علاقوں سے تقریباً آٹھ مہینے کٹ کر رہ جاتا۔ پہاڑی رستے

بھاری برف باری کی وجہ سے بند ہوتے تھے۔ موبائیل فون اور دیگر رابطے اکثر منقطع رہتے۔ گویا پریشانی ہی پریشانی اور جب ان حالات سے چھٹکارہ ملتا تو آدمی خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ یہاں سے ٹرانسفر ہونے پر تبدیل ہونے والا شخص کوئی فیرویل پارٹی نہیں لیتا بلکہ خود اس خوشی میں دوسروں کو پارٹی دیتا۔

لیکن جاوید.......... اسکے چہرے پر نہ خوشی تھی اور نہ اسکے آثار تھے۔ بلکہ آج وہ خلافِ معمول خاموش تھا اور تھوڑا اُداس بھی۔

''جاوید سَر کیا بات ہے؟ آج تمہیں خوش ہونا چاہیے..........'' کلدیپ نے پوچھا۔

لیکن جاوید خاموش ہی رہا اور موبائل فون کو ہاتھ میں لیکر دیکھتا رہا۔

''ارے بھئی جاوید کیا بات ہے؟ کہاں کھو گئے ہو۔ کلدیپ سَر نے کچھ تم سے پوچھا.................''

ریاض نے بولا

لیکن جاوید نے سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کھڑا ہو گیا۔

''جاوید جی۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔ کہیں یہاں دِل لگی تو نہیں ہوئی

ہے'' پٹھانیا بولا۔

لیکن جاوید کچھ کہے بغیر کیفے سے باہر نکلا اور سیدھے اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

سبھی ساتھی حیران تھے کہ جاوید کو کیا ہو گیا ہے۔ پورے چار سال تو یہ سبھی سے ہنس ہنس کر بات کرتا تھا اور بڑا ملنسار تھا لیکن آج خوشی کے موقعہ پر اتنی اُداسی اور خاموشی۔

کسی کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ رات دیر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے لیکن ذہن میں جاوید کا خیال تھا۔

جاوید کمرے میں پہنچ کر سیدھے بیڈ پر لیٹا۔ نہ روٹی تیار کی اور نہ کچھ کھایا پیا۔ اُسے ماضی کی تلخیاں یاد آرہی تھیں اور اُسکے لئے باعثِ عذاب بن رہی تھیں۔ اُسکا سر پھٹا جارہا تھا...............۔

''میں اپنے اِن ساتھیوں کو کیا بتاؤں............... میں ٹرانسفر پر خوش کیوں نہیں ہوں۔ کیسی خوشی کیسی شادمانی .... کیسا شہر، کیسا گھر، کیسے لوگ، رات دن کا کرفیو، بجلی گُل، بیماری، ہر طرف چیخ پکار، موت کا رقص، بات بات پر فائرنگ، پتھراؤ، دھماکے............... نہ سکون اور نہ آرام............ فوزیہ کی ہلاکت...............''

جاوید وادی گلپوش کا رہنے والا تھا جہاں کئی برسوں سے حالات نامساعد تھے۔ سیاست کا شکار یہ علاقہ ہمیشہ ظلم واستبداد کا شکار ہوتا چلا آیا ہے۔ روز ہڑتال، کرفیو، کریک ڈاون، شہادتیں، ہلاکتیں معمول بن گئی ہیں۔ ایک طرف گولیاں، ٹائر گیس اور بکتر بند گاڑیاں اور دوسری طرف گرنیڈ، پتھر، لاٹھیاں.......... یہ پتھر اور لاٹھیاں غم وغصہ اور محرومی اور اُداسی کے ترجمان ہیں۔ جاوید کہاں بھول سکتا وہ شام جب وہ فوزیہ سے ملنے گھر سے نکلا تھا۔ اُسی روز جاوید کا ٹرانسفر آرڈر اجراء ہوا تھا اور اُسے گھر سے دور اِس پہاڑی قصبے میں بھیجا گیا تھا۔

''فوزیہ۔ میرا تبادلہ ہوگیا۔'' جاوید نے کہا۔

''تبادلہ..........کہاں..............'' اسنے پوچھا

جاوید نے فوزیہ کو جب بتایا کہ اسکی ٹرانسفر کہاں ہوئی ہے وہ ششدر ہوکر رہ گئی کیونکہ اُسکو اس علاقے کے بارے میں پہلے سے جانکاری تھی کیونکہ اسکے چچیرے بھائی کا کچھ برس پہلے وہاں تبادلہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔

''فوزیہ۔ تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ تبادلہ تو نوکری میں ہوتا ہی ہے۔ پھر کیا عمر بھر وہاں رہنا ہے؟ کچھ وقت گذار کے ہی واپس آرہا ہوں

............" جاوید نے کہا۔

"تم تو واپس آ ؤ گے مگر کیا معلوم میں مل پاؤنگی کہ............"

فوزیہ نے کہا۔

"پگلی یہ کیا کہہ رہی ہو؟"...............

یہ کہکر وہ گھر چلی اور جاوید نے بھی گھر کی راہ لی۔

ابھی پانچ ہی منٹ ہوئے تھے کہ کہیں سے فائرنگ کی آواز آئی۔ جاوید دوڑتے دوڑتے فوزیہ کو دیکھنے گیا کہ وہ کہاں پہنچی۔ لیکن فائرنگ رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جان بچا بچا کر جاوید گھر پہنچا۔ دو گھنٹے بعد فائرنگ رُک گئی۔ جاوید کو فوزیہ کی فکر ہو رہی تھی کہ وہ گھر پہنچی کہ نہیں۔ آخر وہ گھر سے باہر نکلا پتہ چلا کہ دس بیس آدمی زخمی ہوئے ہیں اور کچھ کی حالات کافی نازک ہے۔ لوگ ہسپتال کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جاوید بھی دوڑتے دوڑتے گیا۔ ہسپتال پہنچ کر پتہ چلا کہ دو ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ ایک کی لاش باہر لائی گئی۔ جاوید بھی اور لوگوں کے ساتھ لاش دیکھنے گیا۔

"فوزیہ...................فوزیہ کی لاش خون میں لت پت۔ اسکے سر پر گولی لگی تھی اور وہ دم توڑ بیٹھی تھی۔"

جاوید کے سامنے اب فوزیہ کا خون آلودہ چہرہ آ رہا تھا۔ واپس گھر

جا کر اسکے زخم تازہ ہونے والے تھے اور یاد ماضی اسکے لئے عذاب بن رہا تھا اسی لئے وہ ٹرانسفر پر خوش نہیں تھا۔ پچھلے چار برسوں میں اس نے مصنوعی چہرا، مصنوعی مسکراہٹ سے اپنا سب کچھ چھپایا تھا لیکن اب ....

جاوید یہی سوچ رہا تھا۔ کہ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''ریاض سَر آپ!''

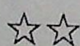
''جاوید میں کچھ کچھ کہنے آیا ہوں۔''

''سر بتایئے نا۔''

''اچھا انسان وہ ہے جو اپنے چہرے سے اپنے دَرد کا اظہار نہ کرے اور ہر بات پر اور ہر حالت میں مسکراتا رہے۔ زندگی انجانے حالات سے بھری ہوتی ہے۔ کبھی خوشی کبھی غم۔ اور تو اور ہم تمام خواہشات کو حاصل بھی نہیں کر سکتے۔ مگر وقت ہمیں وہ ضرور دیتا ہے جس کے ہم حقدار ہوتے ہیں۔ اسی طرح موت اٹل ہے چاہے میری ہو، تمہاری ہو یا فوزیہ کی۔ ہم حقیقت سے منہ نہیں موڑ سکتے یہ قدرت کے فیصلے ہوتے ہیں..........''

''سر کیا فوزیہ؟''

''ہاں .... جاوید تمہاری فوزیہ'' ☆☆



مِڈ نائٹ شاپنگ

میری لاکھ کوششوں کے باوجود میرا بیٹا عامر گھر واپس نہیں آرہا تھا۔ پندرہ سولہ سال پہلے وہ ریاست سے باہر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گیا تھا اور فارغ التعلیم ہونے کے بعد وہیں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اسے اچھی خاصی نوکری ملی تھی۔ پہلے تو وہ سال میں ایک بار ضرور گھر آیا کرتا تھا لیکن اب پانچ سال سے اس نے گھر آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی ایک بہانہ کبھی دوسرا۔ پہلے امتحان، ٹیسٹ، ٹور کا بہانہ اور اب آفس کا کام، بیرون ملک میٹنگ وغیرہ۔ اگر چہ یہ بات صحیح ہے کہ کسی بھی کارپوریشن خاصکر ملٹی نیشنل کمپنی میں کافی محنت، لگن، ڈسپلن سے دن رات کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی سرکاری نوکری نہیں کہ کام کرے نا کرے تنخواہ تو مِل ہی جاتی ہے۔

لیکن عامر کے بغیر بھی بہت سارے لوگ ایسی کمپنیوں میں جاب کرتے ہیں اور تو اور میں خود بھی ایک کارپوریشن میں کام کرتا ہوں۔ سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا ہے دفتری کام بھی اور گھر بھی۔ لیکن عامر..........

مجھے یاد ہے جب میں اور میری اہلیہ نے عامر کو پڑھنے کیلئے باہر بھیجنے کا فیصلہ کیا تو وہ خود اس فیصلے میں شامل نہیں تھا۔ خاموش طبیعت، فرمانبردار، دس سال کا ذہین لڑکا۔ ہر بات پر اقرار اور پھر ہم نے بھی سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ لیا تھا۔ چونکہ ہماری وادی شورش زدہ تھی اور ہر طرف خون خرابا ہو رہا تھا۔ رات دن گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں، روز روز کا کرفیو اور بندھ سکول، کالج، دکانیں، سرکاری دفاتر سب بند، رات بھیانک اور دن خوفناک، دن کو فائرنگ اور رات کو چھاپے اور کریک ڈاون، یہ معمول تھا۔ جبھی ہم نے عامر کو بیرون ریاست بھیجا، ورنہ کون ماں و باپ اپنے معصوم لختِ جگر کو اپنے سے دُور رکھنا چاہے گا۔ یہ ایک مجبوری تھی اور شاید ضرورت بھی۔

اب کتنے سال گذر گئے۔ زمانہ بدلا، لوگ بدلے، دُنیا بدلی مگر ہمارے حالات ابھی نہیں بدلے۔ معلوم نہیں ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ کشیدگی، کچھ دن تھوڑی خاموشی اور اسکے بعد وہی کشیدہ حالات۔

آج جب باہر پھر کرفیو ہے، ہڑتال ہے، بند شیں ہیں، ہر طرف ویرانی ہے، موبائیل، فون اور ساری انٹرنیٹ کی سروسیں معطل ہیں، سڑکیں سنسان ہیں اور کہیں کہیں دور سے نعرے بازی اور مظاہروں کی آوازیں آرہی ہیں تو اچانک دو ہفتے سے خاموش موبائیل کی رِنگ بجی۔

''ہیلو''

''ہیلو۔ السلام علیکم۔ پاپا میں عامر ہوں............ گھر پر سبھی ٹھیک ہیں نا؟۔ آپ کیسے ہو؟ مما کیسی ہے؟''

''عامر بیٹا۔ تم! ہم سب ٹھیک ہیں اور تم کیسے ہو؟''

''پاپا میں ٹھیک ہوں۔ میں امریکہ گیا تھا اور کل ہی واپس آیا۔''

آپ کے ہاں نہ فون جاتا تھا اور نہ ہی میل۔ میں نے کافی کوشش کی۔ پھر پتہ چلا کہ وہاں یہ تمام سروسیں بند ہیں۔ اور حالات کافی کشیدہ ہیں۔ میں رات بھر سویا نہیں اور اب مشکل سے فون لگا'' عامر نے کہا۔

''بیٹا۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے۔ یہاں تو یہ روز کا معمول ہے۔ مگر آج کل حالات قدرے خراب ہیں۔ ہم فون کرتے لیکن سارے موبائیل فون بند ہیں اور شاید اس ایک موبائیل کمپنی کو اِن کمینگ کالز کیلئے اجازت ملی ہے۔ جبھی آپ کو فون لگا۔ بیٹا تم فکر نہ کرنا۔ ہم یہاں ٹھیک ہیں۔ دن بھر گھر

کے اندر ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مسجد تک نکلتا ہوں۔ کھانے پینے کی چیزیں ابھی گھر میں موجود ہیں۔ ہاں روٹی اور دودھ کی تھوڑی پرابلم ہے لیکن کچھ رضا کار لوگ گاہے بگاہے وہ بھی لاتے ہیں۔

"پاپا میں بھی ایک دو دن میں آ رہا ہوں..........."

"کیا کہاں..........."

"میں ایک دو دن میں آ رہا ہوں پاپا۔ بہت یاد آ رہی ہے آپ لوگوں کی۔"

"سُنتی ہو عامر کی ماں۔ عامر ایک دو دن میں آ رہا ہے..........."

میری اہلیہ نے یہ سُن کر میرے ہاتھ سے موبائیل چھین لیا اور بات کرنے لگی

"عامر بیٹے۔ تم جلدی آ جاؤ میری بھی آنکھیں ترستی ہیں تمہیں دیکھنے کے لئے"۔

وہ بات ہی کر رہی تھی تو فون کٹ گیا۔ موبائل والوں پر غصہ کرنا لازمی تھا لیکن اس وجہ سے تھوڑا کم تھا کہ وہ خوش تھی کہ اسکا بیٹا پورے پانچ سال کے بعد گھر آ رہا ہے یہ تو وہی سمجھ سکتا ہے یا محسوس کر سکتا ہے جو ان حالات میں ہو۔

’’بیگم۔ عامر نے تو ایک دو دن میں آنے کی بات کی ہے مگر وہ کیسے یہاں آئیگا۔ مانا کہ ائیر پورٹ تک پہنچ پائیگا لیکن وہاں سے............‘‘میں بیگم سے کہہ ہی رہا تھا کہ وہ غصہ میں بولی۔

’’شبھ شبھ بولو۔ وہ ضرور آئیگا۔ اللہ اسکی حفاظت کریگا۔ ماں کی دعا اسکے ساتھ ہے۔ وہ ضرور آئیگا............‘‘

’’میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ آئے لیکن اِن حالات میں۔ کرفیو ہے، بندشیں ہیں ٹریفک بند ہے............‘‘

’’اُسے ایرپورٹ پر کرفیو پاس دینگے۔ آخر اتنا تو ایرپورٹ آنے والے اور وہاں سے جانے والے مسافروں کیلیئے کیا جاتا ہوگا............‘‘ وہ بولی

’’کرفیو پاس!۔ وہ تو پولیس اور سیکورٹی فورسز والوں کیلیئے ہیں تاکہ وہ نہ روکیں۔ ویسے بھی یہ انکے موڈ پر منحصر ہے۔ پچھلی بار میرے پاس کرفیو پاس بھی تھا تب بھی انہوں نے مجھے آفس جانے سے روکا۔ اور پھر مظاہرین، وہ کرفیو پاس کیا مانیں۔‘‘ میں نے کہا۔

خیر دو دن کیسے گذرے اللہ ہی جانتا ہے۔ ویسے انتظار کی گھڑیاں ہمیشہ لمبی ہوتی ہیں لیکن ہمارے لئے خاصکر عامر کی ماں کیلیئے یہ کچھ زیادہ ہی

لمبی ہو رہی تھی۔ بیتابی، تذبذب، انتظار، شفقت اور بیقراری۔ ان ایام میں وہ رات کو بھی سوئی نہیں صرف عامر کی باتیں کرتی رہی۔

آخر دو دن بعد علی الصبح عامر کا فون آیا کہ وہ گھر آ رہا ہے اور فلائٹ ٹائمنگ کے حساب سے وہ دن کے دو بجے ائیر پورٹ پہنچے گا اور قریباً چار بجے گھر پہنچے گا۔ اسنے یہ بھی بتایا کہ جونہی انکا جہاز ائیر پورٹ پر اُترے گا وہ پھر فون کریگا۔

دو، ڈھائی بجے عامر کا پھر فون آیا اور اسکی ماں نے لپک کے فون میرے ہاتھ سے لیا''

''ہیلو بیٹا۔ تم پہنچ گئے۔''

''ہاں۔ مماّ۔ میں ائیر پورٹ پہنچ گیا۔ میں اب گھر کی طرف ہی نکل رہا ہوں۔ اور ہاں مجھے کرفیو پاس ائیر پورٹ پر دیا گیا ہے اور عاقب بھی میرے ساتھ ہے وہ یہیں ائیر پورٹ پر ملا وہ دوسری فلائٹ سے آیا تھا۔ ہم دونوں یہاں سے اکٹھے نکل رہے ہیں.............''

رات کے آٹھ بجے تک عامر گھر نہیں پہنچا۔ ہم دونوں میاں بیوی پریشان ہو گئے۔ میں عاقب کے والد میر صاحب سے ملنے اُن کے گھر گیا وہاں پتہ چلا کہ ائیر پورٹ سے ہمارے علاقے تک آنے والے روڑ پر

کہیں مظاہرے ہو رہے ہیں اور پتھراؤ بھی ہو رہا ہے لہٰذا اُنہیں ابھی ائیر پورٹ کے باہر نزدیک ہی کہیں روکا گیا ہے۔ ویسے میر صاحب کا ایک دوست ان کو اپنی گاڑی میں ائیر پورٹ سے لانے گیا تھا اور وہ تو اُنکو گھر پہچانے والا تھا۔ میر صاحب کی بات سُن کر تھوڑی تسلی ہوئی اور میں نے اہلیہ کو بھی بتایا۔ آخر رات کے قریباً دس بجے ہمارے گھر کے باہر ایک گاڑی رُکی اور اسمیں عامر باہر نکلا۔ ہم دونوں گیٹ کے پاس ہی کھڑے تھے۔ گاڑی میں میر صاحب کا دوست اور عاقب بھی تھا۔ لیکن اپنے بیٹے کو دیکھکر میں ان کیطرف زیادہ متوجہ نہیں ہوا اور ایسے ہی خیر و عافیت پوچھی وہ چلے گئے اور عامر اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر گھر کے اندر آ گیا۔

''عامر۔ ارے بیٹا۔ ہماری طرف بھی نظر ڈالو۔ مانا تمہاری ماں کو تم سے از حد لگاؤ ہے لیکن میرے بھی آنکھ کے تارے ہو۔'' میں نے کہا

عامر کافی تھکا ہوا تھا۔ کپڑے چینج کر کے فوراً کھانا کھایا۔ وہ بھی اپنی ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوا اور پروسا ہوا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ انگلیاں چاٹ رہا تھا۔

''چلو بیٹا۔ اب اس وقت آرام کرو۔ باقی باتیں صبح کرینگے'' میں نے کہا

’’کیوں ۔ابھی سے نیند آ رہی ہے۔ پہلے مجھے اپنے بیٹے کو پوری طرح دیکھنے تو دو..........‘‘وہ بولی

’’کل دیکھنا پورے دن۔ ویسے بھی باہر کل نہیں نکل سکتے ہو۔ابھی ہڑتال کی کال ہے وہ بھی چار دن کیلئے ۔آگے کا پتہ نہیں۔ لہٰذا کل دن بھر خوب باتیں کرو۔‘‘ اس کے بعد عامر سونے کیلئے کمرے میں چلا گیا اور اسکی ماں اسکے پیچھے پیچھے۔

’میں آج عامر کے پاس ہی سو جاؤ نگی اور آپ چاہیں تو اپنے کمرے میں سو جایئے۔‘‘ماں کی ممتا یا ضد...... مجھے لبیک کرنا پڑا۔

دو دن ہم تینوں صبح سے شام تک کھاتے پیتے رہے، باتیں کرتے رہے۔ ہماری تو عادت ہے اب دن بھر اِسی طرح بیٹھے رہنے کی لیکن عامر دو دن کے بعد ہی بوُر ہو گیا۔

’’پاپا۔ پورے دن بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا ہوں۔ بڑی بوریت ہو رہی ہے۔ آپ لوگ کیسے یہ برداشت کرتے ہیں؟۔ مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے یہ بھی کوئی زندگی ہے؟۔ یہ بھی کوئی جینا ہے؟۔قیدیوں کی زندگی ہے۔‘‘

’’یہ تو بیٹا ہمارا مقدر ہے اور شاید ہمارے گناہوں کی سزا............‘‘

میں نے عامر سے کہا

"پاپا۔اسی لئے میں یہاں واپس نہیں آنا چاہتا ہوں۔کیا رکھا ہے یہاں۔انسانیت کا نام ونشان نہیں۔ظُلم وستم ،تباہی ،بربادی ،بے چین زندگی یہاں تو آدمی ذہنی مریض بن جائیگا۔یہاں کے لوگ چلتی پھرتی لاشیں ہیں........."عامر کہہ رہا تھا۔

"بیٹا۔یہ سب کچھ سچ ہے اور صحیح بھی ہے۔مگر زندگی اسی کا نام ہے۔زندہ دل وہ ہے جو ان حالات میں جیئے ،انکا مقابلہ کرے۔ہمیں سیکھنا ہے ان حالات میں رہنا۔یہ ہماری سرزمین ہے یہاں ہمارا گھر ہے۔یہاں ہمارے جدواجداد رہ چکے ہیں۔حالات ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے۔پہلے سے تو حالات قدرے بہتر ہیں۔یقین رکھو جہاں دھوپ وہاں چھاؤں۔ہر رات کے بعد دن کا آنا اور سورج طلوع ہونا قانونِ قدرت ہے۔پھر بات یہ بھی ہے کہ دنیا کی کونسی جگہ ہے جہاں اس وقت امن ہے، شانتی ہے۔ہر جگہ بدامنی ہے، جنگ ہے، تشدد ہے،ہمیں اپنے لوگوں کے بیچ رہ کر ان کی مدد کرنی چاہیئے اور ایکدوسرے کے کام آنا چاہیئے۔جئیں گے یا مریں گے لیکن سب مل کر۔اس طرح دور رہنا، بزدلی ہے اور اپنے لوگوں سے بے وفائی ہے۔ بیٹا میرا مانو تو اب لوٹ آجاؤ۔

اپنے لوگوں میں رہ کر جینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ دکھ ہو یا سکھ اپنے تو اپنے ہوتے ہیں۔ یہاں میں اور تمہاری ماں ہم بھی تمہاری راہ دیکھتے ہیں۔ ہمارا بھی تمہارے سوا کون ہے۔ آؤ اکٹھے مل جل کر رہیں۔ ہم اپنے گھر کو جنّت بنائینگے۔ ہاں یہ بھی یاد رکھو۔ اب حالات آہستہ آہستہ سدھر رہے ہیں۔ ابھی تم دس پندرہ دن یہاں ہو خود دیکھ لینا'' میں عامر کو گھر واپس آنے کی ترغیب دے رہا تھا اور اسی بیچ عامر کی ماں کہنے لگی

''آپ کیا سمجھا رہے ہو بیٹے کو۔ یہ تو خود سمجھدار ہے، کہاں جائے گا ہمیں چھوڑ کر۔ اب ہم تینوں یہیں رہینگے۔ ہاں اگر اس نے جانے کی ضد کی تو اسے میری میت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ میں جان دونگی لیکن اسے اب جانے نہیں دونگی۔''

ہفتے کا دن تھا کہ عامر کی ماں جو بلڈ پریشر کی مریض تھی اُسکی دوائی ختم ہوئی۔ رات کا وقت تھا، باہر سب دکانیں بند تھیں اور راستے سنسان۔ پریشان تھے کہ دوائی کہاں سے لائیں۔ آخر عامر نے کہا کہ وہ سکوٹر پر ہسپتال جائے گا کیونکہ وہاں دوائی کی دکان کھلی ہوگی یا کم از کم ہسپتال میں تو دوائی ملیگی۔ رات دو بجے کا وقت تھا جب وہ ہسپتال جاتے ہوئے مین مارکیٹ سے گذرا تو ہکا بکا رہ گیا۔ وہاں علاقے کی دو تین کاروبار کی بڑی

دکانیں کھلی تھیں۔ دیکھا تو یہ واحد شاہ اور میر حیات کی دکانیں تھیں۔

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ دن میں سب دکانیں بند اور رات کو یہ دوکانیں کھلیں اور دکانوں پر گاہکوں کی بھیڑ۔ وہ بھی ان لوگوں کی جو اس تحریک اور مظاہروں کی قیادت کرتے ہیں۔ بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں۔ دن کو بند، شام کو بلیک آوٹ اور پھر یہ ''مِڈ نائٹ شاپنگ''، چھوٹے چھوٹے دوکانداران سے مال خرید رہے تھے اور وہ بھی مہنگے داموں پر۔ کیا خوب۔ دن کو ایک کاروبار اور رات کو دوسرا..........'' عامر اندر ہی اندر سوچ رہا تھا۔

ہسپتال پہنچا تو وہاں دوائی کی دکان بھی بند تھی مشکل سے ہسپتال میں کسی نرس نے دوائی کی دو ٹکیہ دیدی۔

دوسرے دن عامر دن بھر مڈنائٹ شاپنگ کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیسا عجیب کاروبار۔ دنیا دن کو کاروبار کرتی ہے اور یہاں رات کو اُلٹا......شاید یہاں ہر چیز اُلٹی ہے۔

شام کا وقت ہر طرف نعروں کی گونج تھی۔ بڑے زور شور سے مظاہرے ہو رہے تھے اسی دوران فائرنگ کی آواز آئی۔ صبح پتہ چلا کہ رات کو مظاہرین اور پولیس کے بیچ جھڑپ ہوئی تھی، پولیس نے گولیاں

برسائی تھیں اور کچھ ہلاکتیں ہوئی تھیں۔ باہر کرفیو لگایا گیا تھا۔ کس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عامر نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک ہمسایہ تھا۔ ''آپ کے والد صاحب اِدھر ہی ہیں نا............''

''ہاں۔ کیا بات ہے؟''

''کہتے ہیں کہ کل کی فائرنگ میں میر صاحب کا بیٹا عاقب مارا گیا ہے اسکی لاش پولیس سٹیشن سے لانی ہے۔............'' یہ سُن کر عامر کے ہوش اُڑ گئے۔ اسی دوران عامر کے پاپا آئے اُسنے سب سُنا تھا جب شام کو مظاہرے ہو رہے تھے تو عاقب اُس وقت اپنے ننہال سے واپس اپنے گھر آرہا تھا جو نزدیک ہی رہتے تھے۔ اچانک فائرنگ ہوئی اور ان کی چھاتی کے نزدیک دِل پر گولی لگی تھی۔ اس وقت اُسے ہسپتال لے جایا گیا تھا مگر اُس نے راستے میں ہی دم توڑ دیا تھا۔

تین دن کے بعد بھی کرفیو میں کوئی ڈھیل نہیں دی گئی۔ یہ تین دن عامر گھر میں خاموش بھوت کی طرح رہا۔ نہ ہنسنا، نہ بات کرنا نہ کسی چیز میں دلچسپی۔ رات کا وقت تھا سب سو گئے تو دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ ''عامر ۔ یہ کیا۔ یہ بیگ اور اٹیچی............'' عامر کے والد نے عامر کو اپنے کمرے سے ہاتھوں میں ایک بیگ اور اٹیچی اُٹھاتے ہوئے دیکھا۔ ''پاپا۔ میں

......میں واپس جا رہا ہوں......'' عامر نے کہا

''کیوں بیٹا۔ اچانک اور وہ بھی اس وقت، اندھیری رات میں''

والد نے پوچھا ''پاپا میں اور زیادہ دیکھ نہیں سکتا۔ یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ یہاں موت رقصاں ہے۔ عاقب نے ابھی ابھی ایم بی بی ایس کمپلیٹ complete کیا تھا۔ وہ بھی اب واپس گھر آ گیا تھا۔ دیکھا اس کا حشر۔'' عامر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''بیٹا۔ ابھی رات ہے۔ تم واپس کمرے میں جاؤ اور آرام کرو۔ صبح ہو گی تو بات کرینگے۔ ورنہ ابھی تمہاری ماں بھی جاگ جائیگی۔''

''پاپا یہاں تو سب کچھ رات کے اندھیرے میں ہی ہوتا ہے، ماں کو سونے دو ورنہ وہ مجھے جانے نہیں دے گی''

ماں دروازے کی اوٹ میں سب سُن رہی تھی اور اسکی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''بیٹا۔ جاؤ خدا کے حوالے۔ جہاں رہو خوش رہو سلامت رہو۔ میں تو بس تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''



بددُعا

ہسپتال میں کافی بھیڑ تھی اور اتنی بھیڑ دیکھ کر میں پریشان ہو گیا کہ شاید کوئی شدید معاملہ ہے، جسکی وجہ سے اتنی بھیڑ اُمڈ آئی ہے۔ گتھم گتھا شور وغل اور لوگوں کا آگے پیچھے تیز تیز دوڑنا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ چونکہ اس شہر میں مجھے آئے ہوئے ابھی دو ہی مہینے ہو گئے تھے۔ اور وہ بھی ایک ریسرچ (تحقیقاتی) پروجیکٹ کے سلسلے میں لہذا مجھے شہر کی زیادہ جانکاری نہیں تھی۔ ہاں اتنا سنا تھا کہ شہر میں وقتاً فوقتاً حالات خراب ہو جاتے ہیں اور اس دوران خون خرابا اور آگ زنی بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ شہر اک شورس زدہ علاقے کا ہی حصہ تھا۔

شاید آج پھر حالات خراب ہو گئے ہیں۔ اور اس لئے ہسپتال میں بھیڑ ہے۔ معلوم نہیں کتنے لوگ زخمی یا ہلاک ہوئے ہونگے۔ ویسے صبح جب

میں اپنے کمرے سے نکلا تھا تب تو کسی نے نہیں بتایا کہ ایسا کچھ ہوا ہے۔ اور تو اور ٹریفک بھی حسب معمول چل رہا تھا اور دکانیں بھی کھلی تھیں۔

میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات اُبھر رہے تھے۔

''بھائی صاحب۔ کیا بات ہے؟............سب کچھ تو ٹھیک ہے نا'' میں نے ایک شخص سے پوچھا جو پارکنگ جگہ پر کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہی تو ہے۔ آپ............''

اُسنے اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ میں نے پوچھا

''پھر یہ اتنی بھیڑ.........اتنے لوگ یہاں کیوں ہیں؟''

''صاحب جی یہ ہسپتال ہے۔ یہاں بھیڑ نہیں ہوگی تو کہاں ہوگی۔ کچھ مریض ہیں کچھ تیماردار ہیں اور کچھ ایسے ہی۔ یہ ہسپتال کا آوٹ ڈور بلاک ہے۔ یہاں روز اتنی بھیڑ ہوتی ہی ہے۔..........''

''لیکن اتنی زیادہ بھیڑ'' میں نے پوچھا۔

''صاحب جی۔ دراصل ابھی آوٹ ڈور میں کوئی ڈاکٹر نہیں آیا ہے۔ اس لئے لوگ ابھی انتظار میں ہیں اسی لئے بھیڑ جمع ہوگئی ہے۔''

''صاحب جی۔ لگتا ہے کہ آپ اِس شہر کے نہیں ہیں۔ پردیسی لگتے ہو۔..........''

''ہاں میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں ....''

''صاحب جی۔ یہاں ڈاکٹر صاحبان ساڑھے دس سے گیارہ بجے تک آ ہی جاتے ہیں۔ ان کے آنے کا وقت تو دس بجے ہے لیکن وہ کہاں آتے ہیں۔ دراصل انکے اپنے پرائیوٹ کلنک ہیں جہاں وہ صبح و شام پرائیوٹ پریکٹس کر کے خوب کمائی کرتے ہیں۔ اُس کمائی کے آگے انکی تنخواہ تو بس جیب خرچ کے برابر ہے۔''

یہ شخص بات سولہ آنے کی کر رہا تھا۔ اس کو ہسپتال کے پورے حالات کا علم تھا اور باتوں باتوں میں اُسنے مجھے یہ بھی بتایا کہ کس طرح سرکار کی طرف سے ہسپتال میں مفت تقسیم کیلئے دوائی باہری میڈیکل شاپ والوں کو بیچی جاتی ہے اور یہ بھی بتایا کہ مختلف قسم کے ٹیسٹ وغیرہ بیماروں سے باہر ہی کروائے جاتے ہیں یہ کہکر کہ یہاں مشین خراب ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر باہر سے کمیشن ملتا ہے۔ گویا ہسپتال نہیں بلکہ کمائی کا مرکز ہو ۔

یہ شخص اصل میں اس ہسپتال کا ایک چوکیدار تھا۔ ہسپتالوں میں کس طرح بیماروں کو بیڈ دئے جاتے ہیں۔ کس طرح انہیں ریفر کیا جاتا ہے۔ ایمبولینس کن لوگوں کو دی جاتی ہے، کیسے دی جاتی ہے، یہ سب اسکو معلوم تھا۔ وہ خود بھی ان سب باتوں سے دکھی تھا۔ جب ہی دل کی بھڑاس نکالنے

کے لئے یہ سب کچھ مجھے بتا رہا تھا۔

''لیکن صاحب، ایک بات ضرور ہے کہ جب کبھی یہاں حالات خراب ہو جاتے ہیں اور پتھر بازی، ٹیر گیس اور گولیاں چلنے سے متعدد لوگ زخمی ہو جاتے ہیں اور وہ ہسپتال بھیجے جاتے ہیں۔تب یہ ڈاکٹر یقیناً حلال کی کمائی کھاتے ہیں۔ ان دنوں انکی نیند حرام ہو جاتی ہے، دن رات کام میں مشغول ہوتے ہیں۔''

اس شخص کی باتوں سے مجھے اِس شہر اور اسکے حالات کو دیکھنے کا دریچہ کھُل گیا۔ہسپتال کے باہر کا منظر اور اسکے بارے میں یہ سب سُن کر مجھے ہسپتال کے اندر جانے اور پوری طرح دیکھنے کا شوق اُبھرا۔ ویسے مجھے بھی ہسپتال میں اپنے پروجیکٹ ورک کے ساتھ وابستہ ایک ساتھی کا حال پوچھنے کا موقع ملا۔ جو ایک روز پہلے سینے میں تکلیف ہونے کی وجہ سے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ پہلے آنا مجبوری تھی اور اب چوکیدار کی باتیں سُن کر یقیناً شوق پیدا ہوا۔

ہسپتال کے انڈور بلاک میں داخل ہو کر میں سیدھے اس وارڈ کی طرف چل پڑا جہاں میرا ساتھی ایڈمٹ تھا۔ اسکی حالت اب قدرے بہتر تھی لیکن ڈاکٹروں نے ابھی چند روز ہسپتال میں ٹھہرنے کو کہا تھا۔ اس وارڈ

کے پرلے سائڈ ایک خصوصی وارڈ تھا جسمیں صرف چند ہی بیمار تھے، اور وہاں کچھ خالی بیڈ تھے لیکن دوسرے وارڈوں میں کہیں کہیں ایک ہی بیڈ پر دو دو مریض لیٹے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر ہسپتال میں بیڈوں کی کمی ہے اور اس وجہ سے کہیں کہیں دو دو مریض ایک ہی بیڈ پر دکھائی دیتے ہیں تو اس پرلے والے وارڈ میں کیوں چند بیڈ خالی ہیں۔ میں اس وارڈ میں چلا گیا اور وہاں موجود دس بیڈوں پر چار بیڈوں پر موجود مریضوں سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بات کرنے کیلیئے تیار ہی نہیں تھے، جوں ہی میں ان کے پاس جاتا وہ اپنا منہ دوسری طرف موڑ دیتے۔ آخر ایک مریض سے میں نے بڑے حلیمانہ انداز میں پوچھا۔

''بھئی......آپ یہاں کب سے ہیں............؟

وہ میری طرف متحرانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسکے دائیں بازوں پر پلسٹر تھا اور اسکے ماتھے پر بھی پٹی تھی۔

جب میں نے پھر پوچھا ''بھئی آپ ٹھیک ہیں نا............''

اسکی آنکھوں میں آنسو آئے اور وہ اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

''بھئی۔ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ باہر سے آیا ہوں

یہاں ایک دفتری کام کیلئے .... آپ لوگوں سے ایسے ہی ملنے کومن کرا۔ میری بات کا بُرا نہ مانئے۔ میں بھی ایک انسان ہوں۔ آپ کی طرح.......... سوچا کہ آپ سے آپکا حال چال پوچھوں۔ دراصل اُس دوسرے وارڈ میں میرا ایک ساتھی ایڈمٹ ہے اور میں اسی سے ملنے آیا تھا۔''

میں یہ کوشش کررہا تھا کہ وہ مریض مجھ سے بات کرے۔ آخر میری کوشش کامیاب ہوئی اور اس جوان مریض نے آہ بھر کر مجھ سے بات کی۔

''بھائی صاحب۔ ہم اس وارڈ میں وہ مریض ایڈمٹ ہیں جو دو ماہ پہلے اس علاقے میں ہوئی گڑبڑ کے دوران جھڑپوں میں زخمی ہوئے تھے۔'' اسنے کہا

''زخمی............ وہ کیسے؟''

''بھائی صاحب۔ ہم سب پولیس والے ہیں۔ جب یہاں کبھی کبھی کوئی گڑبڑ ہوتی ہے حالات خراب ہوتے ہیں تو ہمیں اسکا مقابلہ اور اسکو قابو کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ ہم بھی بال بچے والے لوگ ہیں۔ ہمارے بھی والدین ہیں اور مشکل سے پولیس میں نوکری ملی ہے اور اسطرح گھر کا گذارہ ہوتا ہے۔ جب ہم یہ ڈیوٹی کرنے نکلتے ہیں تو مشتعل ہجوم ہم

پر پتھر برساتے ہیں اور کبھی کبھی جب انکے قابو میں آتے ہیں تو مار پیٹ بھی کرتے ہیں۔ اس دوران ہم بھیڑ کو منتشر کرنے کیلئے ٹئیر گیس اور دیگر ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ بھی زخمی ہو جاتے ہیں اور ہم بھی اور کبھی ہلاکتیں بھی ہوتی ہیں''

''لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے''

''بھائی صاحب۔ ان کے کچھ مطالبات ہوتے ہیں جو سرکار پورا نہیں کرتی یا کر نہیں سکتی۔ یہ تو وہ جانیں لیکن ہم تو ڈیوٹی کے پابند ہیں جو حکم ملیگا وہ عملانا پڑتا ہے۔ ورنہ کون خوش ہے عام لوگوں کو مارنے سے یا ان پر ہتھیار استعمال کرنے سے۔ وہ بھی ہمارے اپنے ہیں، اپنے وطن کے، اپنے شہر کے اپنے گاؤں کے............لیکن افسوس وہ ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ہم ان کے دشمن نہیں۔ ان کی لڑائی یا دشمنی وقت کے حکمرانوں اور سیاستدانوں سے ہے نہ کہ ہمارے ساتھ۔ اور نہ ہماری اُن سے کوئی لڑائی یا جھگڑا ہے۔ ہم اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اور اس وجہ سے اس طرح ان کے سامنے آنا پڑتا ہے۔''

اس جوان مریض کی باتوں سے مجھے یہ پتہ چلا کہ اس وارڈ میں اسی لئے صرف چند بیڈوں پر مریض ہیں کیونکہ احتیاطی طور پر اس وارڈوں

میں صرف پولیس والے ہی رکھے گئے ہیں، جو ورنہ کبھی بھی کسی بھی مزاحمت کا شکار ہو سکتے ہیں اور اس وارڈ میں لوگوں کا آنا جانا بھی محدود ہے۔

ہسپتال سے باہر نکلنے پر وہ چوکیدار مجھے پھر ملا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔

''آپ ابھی بھیڑ کی بات کر رہے تھے نا۔ پچھلے جمعہ کو جب لوگ نماز ادا کرنے کے بعد مسجدوں سے باہر نکل رہے تھے تو پولیس نے ان میں کچھ لوگوں کو پکڑنے کی کوشش کی جس پر موجود لوگوں نے مزاحمت کی تو اس پر لوگوں اور پولیس کے بیچ زبردست جھڑپ ہوئی۔ بھیڑ کو تتر بتر کرنے کیلئے لاٹھیاں برسائی گئیں، ٹائیر گیس چلائے گئے اور لوگوں کی طرف سے زبردست پتھراو ہوا تھا۔ پھر کیا ہوا پولیس والوں نے اندھا دُھند گولیاں چلائیں اور بے رحم ہاتھوں سے ایک معصوم لڑکے کی جان چلی گئیں اور بہت سارے لوگ زخمی ہوئے۔ وہ لڑکا اپنی بیمار بوڑھی ماں کی دوائی لانے گھر سے نکلا تھا۔ یہ پولیس والے ظالم اور بے رحم ہے۔ جیسے ان کے اپنے بچے نہیں ہیں۔ معصوموں کا خون رنگ لائے گا۔ اور کسی کی بددُعا لگ ہی جائے گی''

دو تین روز بعد میں پھر اپنے ساتھی کی خبر پُرسی کیلئے ہسپتال گیا اور

کچھ فروٹ اپنے ساتھ لے لئے۔ پہلے سیدھے اُس جوان زخمی پولیس والے کے پاس چلا گیا اور اسے یہ فروٹ دئے۔ پہلے اُسنے لینے سے انکار کیا لیکن میری ضد کے سامنے اسے یہ لینے پڑے۔ اس بار میں نے پھر خیرو عافیت پوچھی اور اس بار وہ کھلے دل سے میرے ساتھ بات کرر ہا تھا۔

''بھائی صاحب۔ میں آپ کو جانتا بھی نہیں ہوں کہاں کے ہو، کیا نام ہے لیکن معلوم نہیں کہ کبھی پرائے لوگ اپنوں سے بھی قریب کیوں لگنے لگتے ہیں۔ دیکھئے میں ابھی دو مہینوں سے اس ہسپتال میں ہوں اور میں نے اس دوران کبھی اپنے گھر والوں کو نہیں دیکھا......''

''کیوں......کیا وہ یہاں نہیں آتے''

''بھائی صاحب.........کیا بتاؤں'' ایک سرد آہ بھر کر اُسنے کہا ''انہیں یہ معلوم نہیں کہ میں ہسپتال میں زخمی حالت میں ہوں۔ میں نے اُنہیں نہیں بتایا ہے۔ کیونکہ اگر وہ سُنتے تو پریشان ہو جاتے اور تو اور حالت جب خراب تھے تو ان دنوں اگر کسی کو معلوم ہو جاتا کہ میں اس دوران عوام کے ہجوم کو قابو کرنے والے پولیس والوں میں شامل تھا اور انہی جھڑپوں میں زخمی ہو گیا تھا تو میرے گھر والے بھی لوگوں کے عتاب کا شکار ہو جاتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا احتجاجی لوگ ہم پولیس والوں کو اپنا دشمن

سمجھتے ہیں اور ہماری مجبوری نہیں سمجھتے۔اور اس طرح وہ میرے بال بچوں کو بھی نقصان پہنچا سکتے تھے اور شاید گھر کو بھی آگ لگاتے۔ مجھے تو ان لوگوں کے بیچ میں ہی زندگی گزارنی ہے۔ اور پھر سرکار جسکا کام ہم کرتے ہیں کہاں پھر ہمیں پوچھتی ہے.........''

''پھر گھر والوں کو آپکے بارے میں..........''

''میں نے انکو بتایا کہ میں ڈیوٹی پر ہوں اور ابھی چھٹی نہیں مل رہی ہے۔ جوں ہی چھٹی ملے گی گھر آوں گا۔ میرے گھر پر میرے بوڑھے والدین اور ایک بیٹا ہے ان کو دیکھنے کیلئے میری آنکھیں ترستی ہیں لیکن کیا کروں حالات سے مجبور.............. بیٹے کو خوب پڑھا کر بڑا افسر بنانا چاہتا ہوں چاہئے مجھے کتنی ہی پریشانیاں جھیلنیں پڑیں اسکو ضرور بڑا افسر بناؤں گا لیکن پولیس میں نہیں۔''

''کتنا بڑا ہے آپ کا بیٹا''

''ابھی چھوٹا ہی ہے۔نویں میں پڑھتا ہے۔''

اُس کی آنکھیں نم تھیں اور غمِ اندروں چہرے پر نمایاں تھا۔

دو دن بعد اس علاقے کے دوسرے شہر میں حالات خراب ہو گئے اور میں نے انٹرنیٹ میں پڑا کہ دو درجن سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے ہیں

جن میں چند کی حالت تشویش ناک ہے۔ یہ خبر پڑھکر مجھے اُس زخمی جوان کی یاد پھر آئی اور سوچنے لگا کہ نہ معلوم آج کتنے پولیس والے اور عام شہری زخمی ہوئے ہوں گے۔

اگلے ہی دن میں پھر ہسپتال گیا میری ٹانگیں خود بخود چل رہی تھی شاید مجھے اس زخمی جوان سے ہمدردی ہونے لگی تھی، میں نے بازار سے کچھ پھول، اور میوے خریدے اور بیگ میں لیکر اُسے ملنے چلا۔

بھائی صاحب اس بیڈ پر جو زخمی جوان تھا وہ کہاں ہے؟'' وارڈ میں اس جوان کا بیڈ خالی دیکھ کر میں نے دوسرے بیڈ پر بیٹھے مریض سے پوچھا۔

''وہ گھر چلا گیا'' اس نے بولا

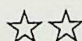
''گھر چلا گیا؟ میں تو پرسوں بھی ادھر تھا وہ گھر جانے کی بات نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی اس کی حالت ایسی تھی کہ اسکو اتنی جلدی ہسپتال سے ڈسچارج کیا جاتا۔'' میں نے پوچھا۔

''صاحب جی، وہ ابھی اچھی طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا اور ڈسچارج بھی کہاں کیا گیا اُسے تو مجبوراً جانا پڑا۔''

''کیسی مجبوری''

”صاحب جی، دو دن پہلے اسکے شہر میں دنگا ہوا ہے وہاں حالات بہت خراب ہوئے سب کو معلوم ہے آپ نے بھی سُنا ہوگا۔ اُنہوں دنگوں میں اسکا بیٹا جب سکول سے واپس گھر آرہا تھا تو اُسے راستے میں مشتعل ہجوم کا سامنا ہوا۔ ہجوم کو منتشر کرنے کیلئے پولیس نے گولی چلائی ہے اور اسکو گولی لگی۔ زخمی حالت میں ہسپتال لے گئے تھے، لیکن وہ زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا ہے۔ اسلئے مریض ساتھی جوان کو گھر جانا پڑا............“

میرے ہاتھ سے پھول اور میوؤں کا بیگ ایکدم گر گیا۔



یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

وقار سے میری جان پہچان اس وقت سے تھی جب ہم دونوں نے ایک ہی جگہ ایک ہی کمپنی میں ایک ہی وقت جوائن کیا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ یہ جگہ ہم دونوں کیلئے نئی تھی جہاں اس کا گھر اس جگہ سے شمال کی طرف قریباً چھ سو میل دور تھا وہاں میرا شہر بھی اس جگہ سے جنوب کی طرف تقریباً پانچ سو میل دور تھا۔ دونوں اجنبی اور وہ بھی ایک اجنبی شہر میں دراصل ہم دونوں ایک ہی اپوٹمنٹ لسٹ میں آئے تھے۔ اس نئی جگہ پر نہ اسکی کوئی جان پہچان تھی اور نہ میری۔ جبھی ہم دونوں نے اکٹھے روم شیرنگ کی۔ یہ ضرورت بھی تھی اور مجبوری بھی۔ لیکن بعد میں ہم اچھے خاصے

دوست بن گئے۔ دو سال کی مدت کے بعد دونوں کا تبادلہ اپنے اپنے شہر میں ہوا لیکن ہماری دوستی قائم رہی اور ہم سال دو سال کے بعد ایکدوسرے کے ہاں ضرور ملنے جاتے۔ اگر زیادہ نہیں کم چار پانچ دن کیلئے ضرور اکٹھے رہتے۔ لیکن پچھلے تین سال سے نہ میں اسکے ہاں جا سکا اور نہ وہ ہمارے ہاں آیا۔ اب اس سال میں نے گرمیوں میں اُسکے ہاں جانے کا پروگرام بنایا تھا کیونکہ جب ہمارے ہاں زیادہ گرمی ہوتی ہے تو ان کے ہاں موسم بڑا اچھا اور سہانا ہوتا ہے۔ لیکن اس سال موسم کے ان دو تین مہینوں میں اُسکے شہر میں حالات کچھ بگڑ گئے تھے۔ ویسے بھی بہت برسوں سے وہاں انہی ایام میں حالات زیادہ ہی بگڑتے رہتے ہیں۔ سیاست کا شکار یہ علاقہ شورش زدہ ہے اور سیاست دانوں نے اس علاقے کے مسئلے کو کچھ اس طرح اُلجھا کے رکھا ہے کہ جس کا حل ہونا مشکل لگتا ہے۔ خیر اب جب حالات تھوڑے سُدھرنے لگے تو وقار کے اسرار پر میں اس کے ہاں چل پڑا۔ تین سال کے بعد جب میں وقار سے ملا تو اُسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا سارا حُلیہ بدل گیا تھا۔ صاف اور کلین چہرے پر داڑھی اور سر پر کالے بالوں میں چاندنی.........۔

''وقار بھئی۔ یہ سب کیا ہے؟ داڑھی، بالوں میں سفیدی اتنی

جلدی''

''یار............ یہ وقت کا تقاضا ہے۔ ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی وہی ہوتا ہے جسے ہونا ہوتا ہے۔''

''مطلب......'' میں سمجھا نہیں۔

''بھئی جیسا دیش ویسا بھیس۔ ایک دو ماہ پہلے یہاں حالات خراب تھے۔ ہڑتال بندشوں اور کرفیو کی وجہ سے تمام دکانیں، کاروباری ادارے اور اسکول وغیرہ سب بند تھے۔ مشکل سے کوئی چیز ملتی تھی۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں شیو خود نہیں بناتا تھا۔ اب جبکہ حجامت کی دکانیں بھی بند تھیں اور میں شیو نہ کر سکا۔ شیو بڑھتے بڑھتے داڑھی بن گئی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اب ایسے ہی رکھ لوں۔''

''اچھا یہ بات ہے ...... تو یار تمہارے شیو کے پیسے بھی بچت ہوئے۔ اور ٹائم بھی...... خوب ہے۔ اب اس کو اچھی طرح تراشئے اور ثواب بھی کمائیے......'' میں نے مزاحیہ انداز میں کہا

میری باتوں پر وقار ہنس پڑا۔

رات دیر گئے تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ سیاست، مذہب، اخلاقیات، ہنسی مذاق، گھریلو معاملات، دفتری باتیں۔ گویا ہر

موضوع پر باتیں کیں۔ تین سال بعد جو ملے تھے۔ فون پر کہاں اتنی باتیں کی جاسکتی ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سو گئے۔ اُن کی اہلیہ اور بچے دوسرے کمرے میں سو گئے۔ کیوں کہ اُن کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ دونوں بہت عرصے کے بعد ملے ہیں اور یوں ہمیں بلا خلل گپ لگانے کا موقعہ دیا۔

اگلے روز جمعہ تھا۔ وقار اور میں نزدیکی مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے گئے۔ مسجد لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ پچھلی والی صف میں ہم دونوں بیٹھ گئے۔ امام صاحب وعظ فرما رہے تھے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے مجھے اس کی طرف دھیان بھی نہیں تھا۔ میرا ذہن بکھرا ہوا تھا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ یہاں لوگ کیسے جی رہے ہیں...... لیکن مسجد یں جو لوگ نماز پڑھنے آئے تھے وہ سبھی خوش و خرم دکھائی دے رہے تھے، کسی کے چہرے پر دُکھ، پریشانی، مایوسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ خطبہ مکمل ہوا نماز ادا ہو گئی اور لوگ دعاؤں میں مشغول ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نو دس سال کا معصوم خوبصورت سا لڑکا نمازیوں کے ہر صف کے آگے چل رہا تھا۔ نہ اسکے ہاتھ میں کوئی کشکول تھا نہ اسنے اپنے ہاتھ پھیلائے تھے۔ گویا بھکاری نہیں تھا۔ نہ اسکے ہاتھ میں کوئی رسید بک پیسہ جمع کرنے کیلئے جیسے کہ مسجدوں میں مختلف

مساجد دار العلوم اور دیگر مذہبی اداروں کیلیئے رقم جمع کی جاتی ہے اور نہ کوئی دینی کتاب بیچنے کیلیئے............ میں یہ سمجھ نہیں سکا وہ آخر کیا کر رہا تھا۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد سیدھے وقار کے گھر پہنچ کر میں نے پوچھا

''وقار...... میں نے آج مسجد میں ایک لڑکے کو دیکھا جو نہ پیسہ مانگ رہا تھا نہ چندہ جمع کر رہا تھا مگر ایسے ہی ہر صف کے آگے چلتا تھا۔ وہ کون تھا اور کیا کر رہا تھا؟''

''بھئی کھانا کھالو بعد میں بتاؤں گا............''

کھانے میں تو بہت ساری ڈیشز تھیں لیکن مجھے وہ سب پھیکی لگیں، کیونکہ میرے ذہن میں..............''

کھانا کھانے کے بعد میں نے پھر وقار سے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا۔

''اچھا سنو بھئی......'' وقار نے کہا

''اس لڑکے کی بھی ایک درد بھری کہانی ہے، میں نے جیسے پہلے ہی بتایا کہ چند ماہ پہلے گرمیوں میں یہاں کے حالات کافی خراب تھے۔ بہت سارے ایسے واقعات ہوئے جو ناگفتہ بہ ہیں۔ جس لڑکے کو آپ نے مسجد

میں دیکھا۔ اسکا باپ انہی حالات میں ایک روز جمعہ نماز ادا کرنے کیلئے گھر سے نکلا۔ اُسی دوران کافی دنگے ہوئے۔

حالات از حد خراب تھے۔ پتھر چلے، گولیاں چلیں، ٹیئر گیس چلے، سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور درجنوں ہلاک ہوئے اور انہیں دنگوں میں اس لڑکے کا باپ غائب ہوا۔ معلوم نہیں اسکا کیا ہوا۔ مرنے والوں کی لاشیں وارثوں کو سپرد کی گئی لیکن اسکے باپ کی لاش نہیں ملی۔ کہتے ہیں شاید وہ نزدیکی دریا میں اسی دوران ڈوب گیا جو سرحد کے اس پار چلا جاتا ہے۔ اور اُس وجہ سے لاش نہیں ملی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شاید آگ میں اسکی لاش جلی ہوگی، کیونکہ اُس دوران بہت ساری دکانوں اور مکانوں کو آگ لگائی گئی تھی اور وہ سب جل کر راکھ ہوگئے تھے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس گمشدہ شخص کا اکلوتا لاڈلا بیٹا، یہ لڑکا ہے۔ جو یہ ماننے کیلئے تیار ہی نہیں کہ اسکا باپ مر گیا ہے۔ وہ ہر جمعہ اس مسجد میں آکر ہر صفحہ میں موجود نمازیوں میں اپنے باپ کو ڈھونڈتا ہے کیونکہ اس کا باپ آخری بار جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے ہی گھر سے نکلا تھا اور اب جب اس لڑکے کو اپنا باپ نہیں ملتا تو مسجد کے اندر بہت روتا ہے۔ پھر کچھ لوگ اسکو وہاں سے نکال کر گھر لے جاتے ہیں.........."

''اُف خدایا............ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔''

دوسرے دن صبح سویرے میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور وقار سے واپس جانے کی رخصت مانگی۔''

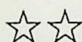
لیکن کیوں...... بھائی...... ابھی دو دن ہی ہوئے تمہیں آئے ہوئے۔تم نے ایک ہفتے کا پروگرام بنایا ہے''

''یار...... دو دن میں اتنا دیکھا...... کہ عمر بھر یاد رہیگا...... یہ خوبصورت جگہ تمہیں ہی مبارک ہو...... خوش رہو......'' میری آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔

ابھی میں چند فرلانگ ہی چلا تھا تو میری نظر اسی لڑکے پر پڑی جسے مسجد میں دیکھا تھا۔ وہ سڑک کے دوسرے کنارے راہ گیروں کو گھور رہا تھا۔ میں نے سڑک پار کی اور اسکے پاس گیا، گلے لگایا اور ماتھا چوما۔ میں نے اسکا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ نزدیکی ٹی سٹال پر لے گیا۔ اور اسکے لئے چائے منگائی ساتھ ساتھ کچھ چاکلیٹ بھی دے دئے۔ اُس نے نہ چائے پی لی اور نہ چاکلیٹوں کو ہاتھ لگایا۔شاید وہ میری زبان اچھی طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔اسلئے میں نے اسی کی زبان میں چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا سہارا لیا وہ میرے ہاتھ کو پکڑے ہوئے بس مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ چونکہ مجھے نکلنا تھا

میں نے اپنی جیب سے کچھ روپے نکالے اور اسکے جیب میں رکھے اور اسے گلے لگا کر چل پڑا۔ ابھی میں دو چار قدم ہی آگے چلا تھا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ اس نے وہ نوٹ جیب سے نکال کر زمین پر پھینکے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک فوٹو تھا۔ وہ ایک نظر اُس فوٹو پہ ڈال رہا تھا اور ایک نظر مجھ پر-----

اور پھر.........اچانک وہ دوڑ کے مجھ سے لپٹ گیا



کفن

سردیوں کا موسم تھا اور چھٹی کا دن تھا۔ میں بڑے آرام کیساتھ ابھی بستر میں ہی تھا۔ بڑا لطف آ رہا تھا۔ گھر میں خاموشی تھی اور ابھی گھر کے سبھی لوگ سوئے ہوئے تھے۔ اچانک باہری دروازے پر کسی نے بیل بجائی اور پھر دستک دینے لگا۔ میں جلدی جلدی اُٹھا اور دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ہمارا ایک دور کا رشتہ دار دروازے پر کھڑا تھا۔

''کون ہے؟'' ماں نے اندر سے پوچھا

مجھے اسکا نام بھی معلوم نہ تھا۔ میں نے اسکو اندر ڈرائینگ روم میں بٹھایا اور اتنے میں ماں بھی آئی۔

''اچھا تم آئے ہو؟'' ماں کا لہجہ قدر حیران کُن تھا

''بیٹا...... یہ شاکر ہے، کریم بھائی کا بیٹا۔ آج پہلی بار یہاں آیا ہے۔'' ماں نے مجھ سے کہا۔

''جاؤ بیٹا اندر سے کمبل اور کانگڑی لاؤ اور خود نہا دھولو'' ماں مجھ سے مخاطب تھی۔

''نہیں چاچی،۔ کمبل اور کانگڑی کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل میں............''

''کیا بات ہے شاکر......'' ماں نے پوچھا۔

''میں بڑی مشکل سے گاؤں سے یہاں آیا ہوں۔ آپکو تو معلوم ہے ۔وہاں حالات ٹھیک نہیں ہے۔ ایک ماہ سے کرفیو لگا ہے، دکانیں کاروبار بند ہیں، ہر طرف افراتفری کا عالم ہے............'' شاکر رُک رُک کر کہہ رہا تھا۔ ''اور چاچی کل تاج خان چاچا جب مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد کے گھر کی طرف آ رہا تھا تو راستے میں فائرنگ ہوئی اور وہ اس کی زد میں آئے۔ان کے سینے میں گولی لگی اور وہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ بیٹھے۔''

''تاج بھئی............ گذر گئے'' ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل

پڑے۔

تاج چاچا میرے چچا تھے اور میرے والد کی پوسٹنگ جب شہر میں ہوئی تھی اور وہ بھی ایک ایسے محکمے میں جس کا دفتر مستقل طور پر شہر میں ہی تھا، چونکہ میری ماں بھی شہر کی رہنے والی تھی وہ اس فیصلے سے خوش تھی میرے والد نے گاؤں چھوڑ کر شہر میں مکان خریدا اور ہم وہیں پر رہنے لگے۔ چالیس سال ہوگئے تب میری پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب تک والد صاحب حال حیات تھے تو مہینے میں ایکبار ضرور گاؤں جاتے جہاں میرے چچا، چاچی اور دادی رہتے تھے۔ پہلے دادی انتقال کر گئی اور پھر میرے والد۔ اب پچھلے پانچ سال سے ہم بس سال میں ایک یا دو بار وہاں جایا کرتے ہیں۔ ویسے اب وہاں ہماری نہ زمین ہے اور نہ مکان۔ وہ تو ہم نے تاج چاچا کو بیچ دیا تھا۔ لیکن پھر بھی جب کبھی گاؤں کی یاد آتی ہے تو ایک چکر ضرور لگا لیتے ہیں۔

تاج چاچا گاؤں کے معززین میں تھے۔ اُنکی وہاں کافی عزت تھی نام تھا۔ انکی ایک اچھی خاصی کپڑے کی دکان تھی۔ جہاں اکثر لوگوں کا آنا جانا ہوتا۔ صرف خریدار ہی نہیں بلکہ دوست احباب، جان پہچان والے سبھی۔ جو بھی آتا قہوہ، چائے پی کے ہی جاتا۔ انکی یہ دکان انکے رہائشی

مکان کے پاس ہی تھی۔گاؤں کے بچے بوڑھے مرد وزن انکو جانتے تھے اور انکا احترام کرتے تھے۔کسی کی کوئی حاجت ہوتی تو تاج چاچا کے پاس آتا، کسی گھر میں شادی ہو، مکان بنانا ہو یا رشتہ کرنا مطلوب ہو، چاچا کے پاس ضرور آتا۔ انکا مشورہ حرف آخر ہوتا تھا۔ ہر اک کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔گویا کہ گاؤں کے بے تاج بادشاہ تھے۔تاج چاچا نے اپنے گھر میں شادی بیاہ پر استعمال ہونے والے پورے برتن رکھے تھے جو بغیر کسی کرایہ یا اُجرت کے کوئی بھی گاؤں والا شادی بیاہ کے موقعہ پر استعمال کرسکتا تھا۔اسکے علاوہ جب بھی گاؤں میں کسی کی موت واقع ہوتی تھی تو کفن کا کپڑا بھی اس کی دکان سے مفت آجاتا۔اسکے علاوہ وہ بیوہ عورتوں اور بے سہارا بچوں کی بھی مدد کیا کرتے تھے۔خاص کر وہ ان بچوں کی طرف زیادہ دھیان دیتا تھا جو زیر تعلیم ہوتے تھے۔کبھی بھی کسی جھگڑے میں اُلجھتے نہیں تھے ہمیشہ صلح وصفائی کو ترجیح دیتے تھے۔چہرے پہ ہمیشہ مسکان ہوتی تھی کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اپنے لئے جی لیتے ہیں اور کچھ دوسروں کیلئے۔ وہ تو اپنے لئے بھی جیتے تھے اور دوسروں کیلئے بھی۔وہ میرے والد سے اگرچہ تھوڑے خفا تھے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر کیوں چلے گئے لیکن زبان پر کبھی یہ بات نہ لائی۔ جب بھی میرے والد یا ہم گاؤں جاتے تو وہ پُرتپاک انداز

میں ہمارا استقبال کرتے۔ ہمیں کبھی محسوس ہونے نہیں دیتے کہ اُنہیں ہم سے کوئی شکوہ یا شکایت ہے۔ اس بات پر وہ خوش ہوتے تھے جب گاؤں کا کوئی آدمی شہر میں نوکری کر کے بھی اپنے ہی گاؤں میں ہی رہنا پسند کرتا تھا۔ ان لوگوں کی وہ بہت قدر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ اپنی مٹی کے وفادار ہیں..................

میری نگاہوں کے سامنے تاج چاچا کی ساری زندگی آ گئی.........

''بیٹا، چلو جلدی کرو.........ہم گاؤں چلتے ہیں.....'' ماں نے کہا۔

ہم تینوں میں، ماں اور شاکر گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔

گاؤں پہنچ کر دیکھا کہ سڑک کے دائیں بائیں کچھ جگہوں پر سکیورٹی فورسز کے افراد مستعدی سے کھڑے تھے۔ دکانیں بند تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ جب ہم تاج چاچا کے گھر کے نزدیک پہنچے تو وہاں لوگوں کی خاصی بھیڑ تھی پورا گاؤں اُمڈ آیا تھا۔ انکی قبر تیار کی گئی تھی۔ وہ لوگ ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر چاچی اور میرے چچیرے بھائی بہن اور نزدیکی رشتہ دار زور زور سے رونے لگے۔ گاؤں والوں کی بھی آنکھیں

اشکبار تھیں اور کچھ عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

چاچا کے سینے میں گولی لگی تھی۔ پورے کپڑے خون سے لت پت تھے لوگوں نے اُسکے اوپر کمبل ڈال رکھا تھا جسے ہٹا کر میت کی غسل کی تیاری ہونے لگی کہ کسی نے کفن لانے کو کہا۔

''لیکن کفن کا کپڑا............ وہ تو تاج صاحب کی دکان سے ملتا ہے۔اور کسی جگہ نہیں...... دکان کی چابی پتہ نہیں کہاں ہے'' کوئی گاؤں والا کہہ رہا تھا۔

سب سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ کہاں سے کفن لایا جائے۔ یہ سن کر میں بھی پریشان ہوا۔

''جس شخص نے ہمیشہ مرنے والوں کیلیئے اپنی دکان سے مفت کفن کا کپڑا دیا ہو آج اُسی کیلیئے کفن کا کپڑا دستیاب نہیں!!! یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے......؟ '' میں اندر ہی اندر سوچ رہا تھا۔

مسجد کے امام صاحب جو دور کھڑے تھے یہ سُن کر آگے آئے اور کہنے لگے

''بھائیو! یہ خون ناحق ہے، تاج صاحب نماز پڑھ کے باوضو اس دنیا سے چل بسے۔ یہ تو شہید ہوئے ہیں اور شہید کو کفن کی کیا

ضرورت۔ شریعت کے مطابق انہیں اُنہی کپڑوں میں دفن کرنا جائز ہے جن میں انکی شہادت نصیب ہوئی ہو۔''

میں نے ایک نظر امام صاحب پر ڈالی اور دوسری اپنے چاچا کی میت پر............

واقعی تاج چاچا نے اپنے کفن کا خود ہی انتظام کر رکھا تھا۔



نمک حرام

منسٹری کب کی ختم ہو چکی تھی اور آغا صاحب وہ نہیں رہے تھے جو وہ پہلے تھے۔ نہ وہ جاہ وحشم، نہ وہ ٹھاٹھ باٹھ اور نہ وہ چال ڈھال۔ دس سال پہلے جب حالات خراب ہوئے اور ہر طرف افراتفری، شورش اور جان لیوا حالات پیدا ہوئے، تو برسر اقتدار لوگوں کو کرسی چھوڑ کر بشمولہ دیگر لیڈران کم شورش زدہ علاقے میں پناہ لینی پڑی۔ اپنا گھر بار، یار دوست، رشتہ دار سب سے دور ایک سیکورٹی زون میں چھوٹے سے سرکاری فلیٹوں میں زندگی گذارنے لگے جہاں نہ انکے پاس شاہی رہائشی سہولیات اور نہ نوکر چاکر۔ آغا صاحب بھی ایسے ہی دوسرے لوگوں کے ساتھ رہ کر دن گزار رہے تھے۔ میرے مرحوم والد صاحب کے آغا صاحب کے ساتھ خاصے مراسم تھے۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے اور اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ والد صاحب نے اپنا موروثی کاروبار سنبھالا اور آغا صاحب

سیاست میں آ گئے۔ سیاسی آدمی کے پاس جو گُر ہونے چاہیے تھے وہ آغا صاحب میں پہلے سے ہی موجود تھے۔ چاق و چوبند، ہوشیار، ہر ایک سے مسکراتے بات کرنا، وقت شناس اور حاضر جواب گویا پیدائشی سیاستدان، مگر قدرت کے فیصلے کے آگے یہ سب چیزیں ہیچ ہیں۔ کس کو معلوم تھا کہ حالات اور وقت ایسی کروٹ لیں گے کہ کل کے شاہ آج کے گدا ہو جائینگے۔ اگر چہ اقتدار کے دوران آغا صاحب کبھی کبھار ہی گاؤں آتے تھے لیکن میرے مرحوم والد اور انکے بعد میں جب بھی شہر جاتے تو ضرور آغا صاحب سے ملتے۔ ویسے کبھی اُن سے کوئی کام نہیں پڑا لیکن کبھی کبھار کا یہ ملنا ہمارے قدیمی روابط کی کڑی تھی۔ اب جبکہ وہ دوسرے شہر میں منتقل ہوئے تھے۔ جہاں ہمارا آنا جانا کم ہی تھا پھر بھی سال میں ایک دو بار جب بھی اس شہر میں جانا ہوتا تھا تو ضرور آغا صاحب سے ملتے۔ اب ان کے ہاں لوگوں اور سرکاری افسروں کا آنا جانا نہیں تھا۔ اُن سے ملنے کی اجازت نہیں لینا پڑتی تھی۔ جب جاتے تو کمرے میں اکیلے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے یا اخبار پڑھتے ہوئے ہوتے تھے۔ آج چونکہ مجھے اس شہر میں ایک ذاتی کام تھا لہذا آغا صاحب سے ملنے کا بھی ارادہ کیا۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا جہاں میرا دوسرا ساتھی عباس بھی تھا۔ وہ میرے بچپن کا ساتھی، ہم

جماعتی اور ہمسایہ تھا۔ دراصل اسکا بھی کسی دفتر میں کوئی کام تھا اور اسی سلسلے میں وہ بھی آیا تھا۔ اتفاقاً گھر سے نکلنے کے بعد ہم دونوں ٹیکسی سٹینڈ پر ملے اور وہیں سے اکٹھے آئے۔

''عباس۔ تمہیں کب اُس دفتر میں جانا ہے جہاں تمہارا کام ہے؟'' میں نے عباس سے پوچھا۔

''بھئی۔ دو بجے کے بعد ہی اس دفتر میں اندر چھوڑتے ہیں اور میں یہاں سے ایک بجے نکلوں گا۔'' عباس نے جواب دیا۔

''میرا بھی کام دو بجے کے بعد ہی ہے۔ چلو پھر تب تک ہم دونوں آغا صاحب سے مل کر آتے ہیں.........''

''آغا صاحب۔ ارے یار چھوڑو کمرے میں بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔''

''یار۔ یہاں بیٹھ کر بُور ہو جائینگے۔ تھوڑی چہل قدمی بھی ہو گی اور ملاقات بھی.........''

''چلو۔ جب تم کہتے ہو۔ چلیں۔ ویسے میں کبھی بھی آغا صاحب سے نہیں ملا ہوں، نہ تب جب وہ منسٹر تھے اور نہ اسکے بعد.........''

عباس چلنے کو راضی ہو ہی گیا۔ ''ویسے مجھے بھی ان سے ملنے کا شوق

ہے مگر۔.......''

''السلام علیکم'' 'آغا صاحب'

''وعلیکم السلام، بیٹے ٹھیک ہو۔ گھر میں سب ٹھیک طرح ہیں۔ کب آنا ہوا۔'' آغا صاحب نے پوچھا۔

''جی۔ گھر میں سبھی بخیر و عافیت ہیں۔ کل ہی یہاں آیا ہوں'' میں نے کہا

''بہت خوب۔ اچھا یہ تمہارے ساتھ........'' آغا صاحب نے پوچھا

''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں آپکے ہی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام عباس ہے اور میں اکرم میر کا بیٹا ہوں.........'' عباس بول پڑا

''اچھا۔ تم اکرم میر کے بیٹے ہو۔ وہ تو ہمارا برخوردار تھا لیکن بیچارا جوانی میں ہی چل بسا تھا۔ اچھا تم آج کل کیا کرتے ہو اور اب تمہارے گھر میں کون کون ہے؟'' آغا صاحب نے عباس سے پوچھا۔

''صاحب جی۔ گھر میں میری ماں، چھوٹی بہن اور میری بیوی ہے۔ پچھلے سال ہی میں نے شادی کی۔ میں اپنا چھوٹا موٹا کاروبار کرتا

ہوں۔ گاؤں میں ایک پراویژن سٹور چلاتا ہوں........'' عباس نے جواب دیا۔

''شکر ہے اللہ کا کہ اکرم میر کے وفات کے بعد تم لوگ اچھی طرح زندگی گذارتے ہو۔ ویسے بیٹا میں نے تمہیں آج پہلی بار دیکھا۔ تم شاید مجھ سے کبھی ملے نہیں ہو اور نہ میرے پاس آئے ہو'' آغا صاحب نے پوچھا۔

''ہاں صاحب۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ نہ میں آج سے پہلے آپ سے ملا ہوں اور نہ یہاں آیا ہوں۔........''

''لیکن کیوں؟ اکرم میر کے فوت ہونے کے بعد تمہیں آنا چاہئے تھا شاید تمہارے کچھ کام آتا یا کسی قسم کی مدد کرتا۔ اب آئے ہو جب میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں..........'' آغا صاحب نے کہا۔

''صاحب جی۔ آپ کا شکریہ۔ لیکن میں جان بوجھ کے آپ کے پاس نہیں آیا...............''

''جان بوجھ کے۔ مطلب۔''

''صاحب جی۔ کوئی خاص بات نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں ایکبار ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ گاؤں کے سب

چھوٹے بڑے شادی کی تقریب میں شامل ہوئے۔ میری ماں بھی گئی لیکن مجھے جانے نہیں دیا۔ میں نے ضد کی کہ میں کھانا کھانے نہیں بلکہ دُلہن کو دیکھنے جاؤں گا۔ لیکن ماں نے میری ایک نہ سُنی۔ سب بچے دلہن دیکھ کر آئے اور ان کی ہاتھوں میں مٹھایاں تھیں۔ مجھے مٹھائی کھانے کا شوق نہیں تھا صرف دلہن دیکھنا چاہتا تھا۔ شام کو میں گھر میں گم صُم بیٹھا تھا اور ماں نے مجھے اپنے پاس بلاکر سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا، بیٹے تمہیں دُلہن کو دیکھنا ہے نا۔ تم ضرور دیکھو۔ لیکن آج نہیں۔ وہاں اسکے پاس بڑی بھیڑ ہے وہاں بھیڑ ہوگی کُچل دئے جاؤ گے۔ بیس دن کے بعد دلہن خود سر پر گوبر کی ٹوکری اُٹھائے کھیت پر جائیگی تب آرام سے اُسے دیکھنا۔ نہ بھیڑ ہوگی اور نہ کوئی پریشانی۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا اور تب سے ماں کی سنائی اِسی بات پر عمل کرتا ہوں۔''

عباس کی دلیل سنکر آغا صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور کچھ خاموش لمحوں کے بعد میں نے عباس کا ہاتھ پکڑا اور آغا صاحب سے جانے کی اجازت لی۔ یہ کہکر ہم دونوں وہاں سے چل دئے۔

''عباس۔ تجھے اس طرح آغا صاحب..........''میں نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ عباس بول پڑا۔

”کیوں بھئی۔ میں نے ایسا کیا کہا۔ کوئی گالی نہیں دی، کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ جو سچ تھا وہی بتا دیا........“

عباس کی باتوں میں کڑواہٹ ضرور تھی لیکن اسکی بات سو فیصد درست تھی اس لئے میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ سچ تو یہی ہے کہ جب آغا صاحب منسٹر تھے تو اُن سے ملنا آسان نہیں تھا۔ پہلے اپوینٹمنٹ۔ پھر لائن میں گھنٹوں کھڑا رہنا، سیکورٹی چیکنگ پھر ملاقات کا انتظار اور مشکل سے دومنٹ کی ملاقات........اور منسٹری جانے کے بعد نہ یہ جھنجھٹ اور نہ پریشانی بلکہ خود آغا صاحب کی نظریں لگی ہوئی ہیں کہ کوئی اُن کے پاس آئے۔ آجکل انکی بیوی اور بچے بھی ان کے پاس نہیں بیٹھتے۔ ویسے یہ ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے۔ چڑھتے سورج کی ہی پوجا ہوتی ہے۔ ڈوبتے کو کون پوجتا ہے۔

”مگر عباس۔ آغا صاحب نے کچھ اچھے کام بھی کیے ہونگے کیونکہ اب جبکہ اس کے پاس نہ دولت ہے، نہ کرسی اور وہ جاہ حشمت، ان حالات میں بھی حیدر خان نے اپنے بیٹے کو آغا صاحب کی خدمت پر معمور کیا ہے....“

”معمور تو کیا ہے۔ کیوں نہیں کرتا۔ آغا صاحب کا خاص درباری

تھا۔ بڑے عیش کئے ہیں اُس دور میں.....'' عباس نے کہا۔

''چاہے تم کچھ بھی کہو عباس لیکن حیدر خان اور اسکا بیٹا نمک حلال ہے آجکل کہاں ایسے لوگ ملتے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ بات تو ہے.......'' یہ کہکر عباس نے کچھ کاغذات نکالے اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔

عرصہ دراز سے اسکے ساتھ رہنے والا حیدر خان اسکا وفادار نوکر ہمیشہ اسکے ساتھ رہا۔ ویسے بھی حیدر خان کو آغا صاحب کی حکمرانی کے دوران لوگ چھوٹا آغا کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ اگرچہ یہ طنزیہ تھا لیکن اگر دیکھا جاتا تو یہ بات صحیح تھی۔ آغا صاحب سے کوئی بھی کام کروانا ہوتا تو حیدر خان سے ہی رجوع کرنا پڑتا۔ اس دوران حیدر خان کے اپنے دو بیٹوں کی نوکری بھی لگوادی اور لوگ کہتے تھے کہ اس دوران اسنے بڑا مال بھی کمایا لیکن ظاہری طور ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ حیدر خان کے پاس پرانا ہی مکان تھا اور نئے سرے سے صرف ایک کچن بنایا تھا۔ جن دو بیٹوں کو نوکری میں لگوایا تھا وہ بھی ان پڑھ ہی تھے۔ اور اسی لئے معمولی سرکاری نوکری حاصل کرسکے۔ اب حیدر خان بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور اسنے آغا صاحب کی خدمت کیلئے اپنا چھوٹا بیٹا رکھا تھا۔ اور وہی آغا صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا۔

اس لحاظ سے اگر مانا جائے تو حیدر خان نمک حلال تھا۔

ہم دونوں عباس کے ڈائریکشن آفس چل دیئے۔ عباس وہاں کچھ ملازموں سے ملا اور تب تک میں باہر ایک ٹی سٹال پر اسکا انتظار کرتا رہا۔ جہاں ٹی وی لگا تھا۔ اور ایک لوکل چینل پر گانے چل رہے تھے۔ میں نے ٹائم پاس کیلیئے چائے کا ایک کپ منگایا اور ٹی وی پر پُرانے گانے دیکھ رہا تھا۔ بڑا سکون آرہا تھا۔ آج کے گانے تو......واہیات ہوتے ہیں۔ پرانے گانوں کے بول انمول ہوتے تھے۔ اور اس پر موسیقی اور گانے والوں کی آواز.......محمد رفیع کا گایا ہوا ایک گانا میں بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا..."

اسی دوران چینل کے سکرال پر بریکنگ نیوز آئی۔ "سابقہ وزیر آغا صاحب کو ان کے ذاتی ملازم نے گولی ماردی......" میں ہکا بکا رہ گیا۔ ہوٹل میں دوسرے بیٹھے موجود بھی میری طرح مبہوت ہو کے ہو گئے۔ اسی دوران عباس ہوٹل کے اندر آ گیا اور کہنے لگا۔

"تم نے سُنا حیدر خان کے بیٹے نے آغا صاحب کو گولی ماردی ہے اور وہ وہی پر ڈھیر ہو گیا............."

نمک حرام..................."

☆☆

کشمکش

''زندگی میں ہر کوئی خواب دیکھتا ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے۔ لیکن میں جس خواب کی بات کر رہا ہوں وہ نیند میں دیکھنے والا خواب نہیں ہے۔ بلکہ وہ خواب ہے جو بیداری میں دیکھا جاتا ہے اور جس سے نیند اُڑ جاتی ہے۔ خواہش، چاہت، کچھ حاصل کرنے کا یہ خواب ہر اُس شخص کیلئے دیکھنا ضروری ہے جو کچھ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو۔ یہ خواب دیکھ کر آدمی اپنی کوشش اور جدوجہد کا راستہ متعین کرتا ہے جو اسکو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔''

عیاش سر نے ان ہی الفاظ سے اپنا لیکچر شروع کیا۔ وہ اس تربیتی

ادارے میں بزنس منیجمنٹ کا ابتدائی کلاس لے رہے تھے۔ اس ادارے میں پڑھے لکھے بیروزگار نوجوانوں کو تاجرانہ صلاحیتیں پیدا کرنے کیلئے تربیت دی جاتی تھی۔ ایک ماہ طویل اس تربیتی پروگرام میں پچاس نوجوان مرد و خواتین شرکت کر رہے تھے۔ عیاش سر کے اس ابتدائی لکچر کو پوری کلاس بڑی توجہ سے سُن رہی تھی۔

''ہر انسان کچھ نہ کچھ پانے کی خواہش رکھتا ہے اور اُس خواہش کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد لازمی جُز ہے۔ دنیا میں کتنی ہی مِثالیں موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلسل جدوجہد سے کیا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کوئی بھی کام کریں نتیجہ دو ہی صورتوں میں آئیگا۔ کامیابی یا ناکامی۔ اور دونوں صورتوں میں آپ کا فائدہ ہے۔ کامیابی ملی تو آپکا مقصد پورا ہو گیا۔ اور ناکامی ملی تو تجربہ حاصل ہوا اور پھر تجربہ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ سیاستدان جیسے امریکی صدر ابراہم لنکن، برطانیہ کا نوبل انعام یافتہ وزیر اعظم ونسن چرچل، بڑے صنعت کار جیسیا ہنری فورڈ، سوچیرو ہانڈا، بل گیٹس، امبانی، سائینسدان البرٹ انسٹائین، چارلس ڈارون تھا ایڈیس اور بہت ساری عالمی شہرت یافتہ ہستیاں جنکی مثالیں اس بات کی زندہ جاوید ثبوت ہیں''

عیاش سر کا لیکچر بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ تھا۔ اُس پر اسکا اندازِ بیاں بھی انوکھا تھا۔ میں نے سکول اور کالج میں اساتذہ سے بہت سارے لیکچر سُنے ہیں مگر اتنی دلچسپی کسی لیکچر میں نہیں لی۔ یا تو اس وجہ سے کہ اُن لیکچرز میں وہ مواد موجود نہیں ہوتا تھا جو انہیں دلچسپ اور پُر کشش بنا دیتا یا تو میری کم عقلی یا دماغی ناپختہ گی۔ خیر یہ لیکچر مجھے اُن سب سے الگ لگ رہا تھا دلچسپ اور سبق آموز۔ دوسرے شرکاء کے ساتھ میں بھی سر کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ عیاش سر اپنا لیکچر جاری رکھے ہوئے تھے۔

''اُن لوگوں سے میں مِلا تو نہیں ہوں اور نہ آپ میں سے شاید کوئی۔ لیکن میں ایک ایسے ہی شخص سے مِلا ہوں جس نے اِن لوگوں کی طرح اپنا نام بنایا۔ وہ کیونکر اور کیسے؟ میں بتاتا ہوں۔ آج سے چھ سال پہلے میں ایک سرکاری پروگرام کے سلسلے میں بیرون ریاست گیا تھا جہاں ہمیں مختلف جگہوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان صنعت کاروں اور تاجروں سے مل کر فیڈ بیک حاصل کرنا تھا۔ اسی دوران ایک سیمنار میں میری ملاقات ایک خاتون سے ہوئی جسکا نام ماریا تھا۔ بنگلور سے تین سو کلومیٹر کی دوری پر ایک گاؤں کی رہنے والی یہ عیسائی خاتون قریباً چالیس سال کی عمر کی تھی۔ اِنکے گاؤں کی آبادی ہندوؤں اور عیسائی فرقے کے لوگوں پر مشتمل ہے اور

اکثر لوگ چھوٹی موٹی زمینداری کرتے تھے یا نزدیکی قصبوں یا شہروں میں جا کر مزدوری کرتے تھے۔ اسی کی یہ کہانی ہے۔ جو اُسنے اپنی زبان سے مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے سامنے بیان کی۔ بیس سال پہلے اس نے اپنے گاؤں کے ہائی سکول سے دسویں کا امتحان پاس کیا تھا۔ انٹر کالج گاؤں سے دور ایک قصبے میں تھا جہاں روز آنا جانا مشکل تھا۔ کچھ اِس وجہ سے اور کچھ گھر کی کمزور مالی حالت کی وجہ سے پڑھائی چھوڑنی پڑی تھی۔ وہ تعلیم چھوٹنے پر بہت پریشان تھی۔ اسکی تمنا تھی کہ وہ آگے پڑھ لکھ کر بنگلور جیسے خوبصورت اور شاندار شہر میں اپنی زندگی گذارے۔ ایسے شہر میں جہاں اسکے پاس شاندار عالیشان کوٹھی ہو، لان ہو، سویمنگ پول ہو، گھر میں اچھی سی گاڑی، ٹی وی، صوفا، بیڈ، فرج، گویا عیش و آرام کا ہر سامان میسر ہو۔ خوبصورت اور کشادہ سڑکیں ہوں۔ گھومنے پھرنے کیلئے اچھی پارکیں ہوں۔ بڑے بڑے سینما ہال اور دیگر سہولیات ہوں۔ ایسے ہی شہر اور گھر کا خواب اُسنے خوابوں خیالوں میں بُنا تھا۔ یہ سب چیزیں حاصل کرنے کیلئے اسکا ہدف بنگلور جانا تھا۔ لیکن وہ یہ سب کچھ کیسے حاصل کرسکتی یہ بات اسکو پریشان کرتی تھی۔ اسکی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔ دو سال تک اسی پریشانی میں رہی کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک روز شام کو جب وہ گھر

کے باہر سڑک پر کھڑی تھی تو اسکی نظر رام پر پڑی جو بنگلور سے گھر آرہا تھا۔ رام ماریا کا پڑوسی تھا اور بنگلور میں کوئی نوکری کرتا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور اپنے گھر اپنے گاؤں آتا۔ ایکدم ماریا کے ذہن میں خیال آیا کیوں نہ رام سے مل کر کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کی جائے تا کہ اُسکا بنگلور جانے کا سپنا پورا ہو۔ ماریا جو اسے پہلے رام سے بہت کم بات کرتی تھی اب رام سے کھُل کر باتیں کرنی لگی۔ چھ سات مہینوں میں ان کی ملاقاتیں قرابت میں بدل گئیں۔ دونوں جوانوں کا اس طرح کھُل کر ملنا جُلنا اِس میں تو کچھ بھی ممکن ہے۔ وہ ایکدوسرے کے اتنے قریب ہوئے کہ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ماریا کیلئے یہ رشتہ خوابوں کی تعبیر سے کم نہ تھا۔ اُسے بنگلور جانے کا راستہ مل گیا۔ شادی کی بات ہوئی تو دونوں کے گھر والوں نے صاف انکار کیا۔ دو مختلف عقائد اور مذہب کے لڑکی اور لڑکے کے درمیان شادی کرنا کسی کو منظور نہیں تھا۔ لیکن وہی معاملہ۔ میاں بیوی راضی تو کیا کریگا قاضی۔ دونوں گھر سے بھاگ گئے اور کورٹ مریج کی۔"

عیاش سر کا لیکچر اب زیادہ دلچسپ پر کشش اور پُر تجُسس ہورہا تھا۔ پورے کلاس میں خاموشی چھائی تھی اور سبھی بڑی سنجیدگی اور دھیان سے لیکچر سُن رہے تھے۔

''دونوں ماریا اور رام بنگلور پہنچے۔ کشادہ سڑکوں سے گذرتے ہوئے اونچی عالیشان عمارتوں سے ہوتے ہوئے ایک مضافاتی بستی میں پہنچے۔ جہاں ایک گلی کے اندر ایک چھوٹا سا پرانا مکان تھا۔ رام وہیں رُک گیا۔ بیگ سے چابی نکالی اور تالا کھولا۔ ایک کمرے والا یہ چھوٹا مکان اور اسی میں رام رہائش پذیر تھا۔ کرایہ پہ چھوٹا سا کمرہ جسکے اندر ایک طرف چارپائی اور دوسری طرف کیروسین اسٹو اور چند کھانے پینے کے برتن۔ یہ دیکھ کر ماریا کے ہوش اُڑ گئے۔ دراصل رام ایک گیس ویلڈنگ کی دکان میں ملازم تھا جہاں ماہانہ اُسے پندرہ سو روپیہ ملتے تھے۔ اس بڑے شہر میں اتنی قلیل رقم پر گذارا کرنا اور پھر کچھ بچا کر گھر بھیجنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ لیکن رام بڑی دشواری مگر سوجھ بوجھ سے یہ سب کر رہا تھا۔ ماریا کے سارے سپنے بکھر گئے۔ خواب ٹوٹ گئے اور خواہشات نے دم توڑ دیا۔ وہ عجیب دلدل میں پھنسی تھی۔ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی اور اب...... آگے کنواں پیچھے کھائی۔ واپس جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دانائی اسی میں تھی کہ حالات سے سمجھوتہ کیا جائے اور یہ مجبوری بھی تھی...... ایسے ہی ایک سال گذر گیا اور اب انکے ہاں ایک بچی بھی پیدا ہوئی۔ گھر کے اخراجات بھی بڑھنے لگے لیکن آمدنی وہی کی وہیں۔ ماریا کو اب زیادہ فکر ہونے لگی۔ پُرانے خواب

پھر نیند اُڑانے لگے مگر........اب وہ گاہے گاہے آس پاس میں رہنے والے لوگوں کے مکانوں کے گرد چکر لگاتی اور انکی کھڑکیوں سے جھانک کر کبھی کبھار ٹی وی سیریل دیکھا کرتی۔ بچی کو کمرے میں سُلا کر وہ اب دوپہر کو ٹی۔وی سیریل دیکھنے کسی نہ کسی طریقے کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھتی۔ ان ٹی وی سیریلوں میں بھی عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے۔ جوا یکبار دیکھے وہ دوسری بار دوسری قسط دیکھنے کیلئے بیتاب ہوتا ہے۔ گویا ایک نشہ بن جاتا ہے۔اسی دوران ایکبار ٹی۔وی سیریل کے دوران وقفہ میں ایک سرکاری اشتہار آیا کہ سرکار نے دسویں جماعت پاس بیروزگار نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کیلئے ایک مالی معاونت کی سکیم بنائی ہے۔ جسکے تحت آسان سود پر انہیں بینکوں سے پچاس ہزار روپیہ کی رقم کوئی بھی کاروبار شروع کرنے کیلئے دی جائیگی۔ اسکے لئے درخواستیں دینا مطلوب ہیں۔ ماریا یہ سنکر بہت خوش ہوئی۔ اُسنے درخواست دی تا کہ وہ بھی پچاس ہزار کی رقم حاصل کر کے ایک ٹی۔وی، صوفا سیٹ، بیڈ اور گیس چولہا سمیت گھر کے دوسرے سامان خرید سکے۔ جب امیدواروں کا انٹرویو لیا گیا اُسے منتخب کر کے اسکا کیس اسکے نزدیکی بینک بھیجا گیا۔ وہ از حد خوش تھی جیسے وقت نے ساری خوشیاں اسکے دامن میں بکھیر دی تھی۔ لیکن یہ پچاس ہزار روپیہ حاصل کرنا اتنا

آسان نہ تھا۔ جب وہ متعلقہ بینک پر گئی تو وہاں منیجر نے ماریہ سے کچھ سوالات کئے اور آخر پر لون دینے سے صاف انکار کیا۔ شاید منیجر کو تجربہ کی بنا پر یہ لگا تھا کہ ماریا بینک کے قرضہ کا صحیح استعمال نہیں کریگی۔ اور وہ یہ رقم واپس چُکا نہیں سکتی۔ لیکن ماریا.....وہ پھر بھی روز بینک کا چکر لگاتی رہی۔ ایک دوبار بینک منیجر نے اُسے بینک سے باہر نکلوادیا مگر دوسرے روز وہ پھر آتی۔ کبھی بچی کو کمرے میں سُلا کر اور کبھی اپنے ساتھ لاکر۔ جو لوگ اُسے دیکھتے وہ ماریہ کے متعلق مختلف باتیں بناتے تھے۔ پتہ نہیں یہ جوان لڑکی روز کہاں جاتی ہے.................. جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ لیکن ماریا اس سے بے خبر اور بے خوف تھی۔ دو مہینے لگا تار وہ بینک کا چکر کاٹتی رہی۔ اور آخر منیجر نے اُسے اپنے کیبن میں بُلا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کیوں ایسے ہی بینک کا چکر کاٹ کر اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ لیکن ماریہ نے صاف بتایا کہ وہ تب تک آتی رہینگی جب تک نہ اُسے پچاس ہزار کا قرضہ نہ دیا جائے۔ جب منیجر نے سمجھ لیا کہ یہ پیچھا چھڑانے والی نہیں تو اُسنے ماریا کو ایک تربیتی ادارے سے ٹریننگ کی سرٹیفیکیٹ لانے کو کہا جو اس قرضہ کی واگذاری کیلئے ضروری تھی۔ بینک منیجر سے ایک لیٹر لیکر وہ سیدھے گھر چلی گئی اور رام کا انتظار کرنے لگی۔ آتے ہی ماریا نے رام کو سب بتا دیا۔ جب

پچاس ہزار روپیہ مل جائیں گے تو ہم گھر کی بہت ساری چیزیں خرید سکتے ہیں اور یہ ہمارے لئے ایک سنہری موقعہ ہے۔ رام سے دوسرے دن گھر پر رہنے اور بچی سنبھالنے کی بات منوا کر ماریا دوسرے دن تربیتی ادارے پر پہنچی، جو اسکے گھر سے قریباً پانچ کلومیٹر دور تھا۔ وہاں پہنچ کر اُسے بتا دیا گیا کہ یہ تربیت دس دن کیلئے ہے اور ہر روز آنا ضروری ہے جبھی سرٹیفکیٹ ملے گی۔ اس دوران دن میں دو بار چائے اور دن کا کھانا، تربیتی میٹرِیل مفت میں دیا جائیگا۔ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی مجبوری تھی لہذا پورے دس دن آنا ضروری تھا۔ پہلے ہی روز جب وہ دوسرے شرکاء سے ملی اور تربیت کا پہلا سیشن شروع ہوا جسمیں شرکاء کو ایکدوسرے سے متعارف کرنا، باتیں کرنا، ہنسنا کھیلنا، شامل تھا۔ تو ماریا کو بہت اچھا لگا۔ وہ ایک سال سے زائد عرصہ سے کسی تیسرے شخص سے نہیں ملی تھی، نہ کھل کے بات کی تھی اور ہنسی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہونے لگا اور وہ آرام محسوس کرنے لگی۔ شام کو واپس گھر پہنچکر رام کو پورے دن کی داستان سنائی اور پورے دس دن تربیت پر جانے کی مجبوری بھی سمجھائی۔ رام سمجھدار تھا اور اسے ماریا کے جذبات کا پوری طرح احساس تھا۔ اُسنے ماریا کو تربیت پر بھیجنے پر اتفاق کیا اور خود بچی سنبھالنے پر آمادہ ہوا۔ ماریا کی مالی حالت اس

حدتک کمزور تھی کہ وہ پیدل چل کرادارے میں آتی اور شام کو واپس جاتی اور بیچ راستے میں چپل نکال کر ننگے پاؤں چلتی تا کہ کہیں چپل نہ پھٹ جائے۔ اس طرح دس روز تربیت کے مکمل ہوئے اور اب سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی باری تھی۔ ماریا بہت خوش تھی۔ سرٹیفکیٹ اسکو ملنے والی تھی مگر تربیت کے دوران سرٹیفکیٹ سے بھی زیادہ قیمتی اور اہم چیزیں اُسے ملی تھیں۔ اسکی مردہ جسم میں نئی جان آئی تھی اور اسکے چہرے کی رنگت لوٹ آئی تھی۔ اور تو اور اسکے خیالات میں بہت تبدیلی آئی تھی۔ شام کو گھر پہنچکر رام سے اُسنے کھُل کر بات کی اور بتایا کہ وہ پچاس ہزار لیکر گھر کی کوئی چیز نہیں خریدنا چاہتی بلکہ وہ دونوں مل کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کردینگے تا کہ بینک کا قرضہ بھی ادا کرسکیں اور گھر کی مالی حالت بھی سدھر جائے۔ بڑی محنت سے کام کرینگے۔ رام بھی تیار ہو گیا اور اگلے ہی روز بینک منیجر کو بتایا کہ وہ ویلڈنگ کا کام کرنا جانتے ہیں اور وہ بینک قرضے سے یہی کام کریں گے۔ بینک قرضہ منظور ہوا اور دونوں نے اپنا کام شروع کیا۔ ایک چھوٹی سے جگہ سے شروعات کی۔ رام ویلڈنگ کا کام کرتا اور ماریا مختلف ہوٹلوں، سرکاری دفتروں، دکانوں، گھروں میں جا کر ویلڈینگ کے آرڈر حاصل کرتی اور اسطرح کام کی شروعات کی۔''

عیاش سر تھوڑی دیر کے لئے رکا.... پانی کا ایک گلاس پیا اور پھر شروع کیا

''چودہ سال بعد ماریا کے پاس تین کارخانے ہیں جن میں سو سے زائد ملازم کام کرتے ہیں۔ ملازموں کو کارخانوں پر لانے اور لے جانے کیلئے چار گاڑیاں ہیں بنگلور میں عالیشان کوٹھی ہے جسمیں وہ تمام سہولیات ہیں جن کا خواب ماریا نے دیکھا تھا۔ اپنے پشتنی گاؤں میں مکان ہے۔ گھر میں دو گاڑیاں ہیں۔ گھر کے سامنے بڑا لان اور گھر کا ہر کمرہ ائیر کنڈ شینڈ ہے اسکے پاس اس وقت تین کروڑ کی مالیت کی جائیداد ہے۔ دو سال پہلے اُسے ملک کی کامیاب ترین خاتون تاجر کا ایوارڈ ملا ہے۔ اور ملک کے جس سب سے بڑے عالیشان ہوٹل کو دیکھنے کی ہمیں تمنا ہے وہاں اسے سرکار نے سات دن تک سرکاری مہمان بنا کے ٹھہرایا۔ آج وہ نئی نسل کی خواتین کیلئے مشعل راہ بنی ہے اُس نے اپنے آپ کو ثابت کیا ہے۔ اُسنے ٹوٹتے سپنے کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ کام کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں سے راستہ نکل ہی آتا ہے..................''

عیاش سر کا لیکچر لنچ بریک سے پہلے پانچ چھ منٹ ختم ہوا۔ اور اس دوران ہم انکے لیکچر کی داد دے رہے تھے۔ حقائق کو کہانی کی صورت میں

پیش کرنے کا نرالا انداز اور وہ بھی پُر اثر۔

ہمارا یہ تربیتی پروگرام اتنا دلچسپ تھا کہ یہ پتا ہی نہیں چلا کہ یہ دس دِن کیسے گذرے۔ سیکھنے کو تو بہت کچھ ملا اور اسکے ساتھ ساتھ نئے دوست نئے ساتھی بھی ملے۔ مختلف اوصاف کے ساتھی کوئی کم گو، کوئی باتونی، کوئی شریف النفس اور کوئی باغی طبیعت۔ عالیہ ان سب میں منفرد تھی زندہ دل اور ہنس مکھ ہونے کے ساتھ ساتھ خوش مزاج بھی تھی۔ میری سیٹ پر داہنی طرف بیٹھی ایک تیز خوش مزاج عالیہ نام کی لڑکی تھی وہ سب سے ہنس کر کھل کر ملتی تھی۔ زندہ دل عالیہ شرکاء میں سب سے الگ تھی۔

تربیت کے آخری دن عالیہ نے مجھ سے کہا۔

''اب تو ہم سب لوگ جا رہے ہیں۔ اب آگے کیا کرنے کا خیال ہے۔''

''خیال۔۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں''

''عیاش سر نے پہلے دن ہی کہا تھا کہ حصول مقصد کیلئے خواب دیکھو۔ اور پھر رستہ خود بخود نکل آتا ہے۔۔۔۔۔''

''وہ تو ہے مگر۔۔۔۔۔۔'' میں نے کہا

''مگر وگر کچھ نہیں ہوگا۔ ارادے مصمم ہوں تو کیا کچھ حاصل

نہیں کیا جاسکتا۔ چاہیے کچھ بھی کرنا پڑے اپنا مقصد نہیں چھوڑنا۔ ماریا کو کس طرح کامیابی ملی۔ یہ تو ہمارے لئے اک درس ہے۔ لوگوں کی باتوں کی طرف دھیان مت دو۔ جو کرنا ہے کر کے رہو۔ مقصد حاصل کرنے کیلئے جو بھی اچھا اور ضروری لگے وہ کرنا چاہیئے ۔۔۔"

"لیکن عالیہ جی۔ ایسا کرنے میں اچھے بُرے کی تمیز تو لازمی ہے۔ ہم جس سماج میں رہتے ہیں اسکے کچھ اصول ہیں۔ ضابطے ہیں۔ انکا لحاظ رکھنا لازم ہے۔"

"میں یہ باتیں نہیں مانتی۔ سماج کے اصول ضابطے عام لوگوں کیلئے ہیں جو خاص بننا چاہتے ہیں وہ اِن سے اُوپر اُٹھ کر چلتے ہیں۔ عیاش سر نے یہی سمجھایا کہ کامیابی حاصل کرنے کیلئے کچھ بھی کرو۔"

"لیکن سر نے ایسا تو نہیں بتایا کہ اگر غلط کرنا پڑے وہ بھی کرو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کیا کہہ رہے ہو۔ ہر بات کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ ماریا کی کہانی خود واضح ہے۔۔۔۔"

عالیہ کی باتوں سے مجھے ایسا لگا کہ اُسنے بھی کوئی سپنا دیکھا ہے اور اسکے حصول کیلئے وہ کوشاں ہے اور اسکے لئے وہ کسی حد تک جاسکتی ہے۔

ہم سب نے سرٹیفکیٹ حاصل کیں اور اپنے اپنے گھروں کی

طرف روانہ ہوئے۔

میں تربیت کے چھ ماہ گذرنے کے باوجود میں کوئی کام کاج شروع نہ کرسکا۔ اگرچہ سرکار کی ایک سکیم کے تحت لون کیس بنایا گیا لیکن بینک میں وہ ردی کی ٹوکری میں چلا گیا۔ کاروبار یا کوئی بھی کام شروع کرنے کیلئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور بینک سے وہ میں حاصل نہ کر سکا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ میرے لاولد مرحوم چاچا جان نے بینک سے کبھی قرضہ لیا تھا۔ جو اُسے وقت پر چکانا تھا۔ چونکہ میں والدین کے سایہ شفقت سے پہلے ہی محروم تھا اور چاچا نے ہی پالا پوسا تھا۔ لہذا اُس کا بھی میں ہی وارث تھا۔ بنک والوں نے یہی نقطہ لگا کر کیس رد کر دیا کہ میرے چاچا کے نام اس بنک کی ایک رقم باقی ہے۔ مگر اللہ کی مہربانی تھی کہ محکمہ عدلیہ میں نوکری ملی اور ایک کورٹ میں جونیئر اسسٹنٹ تعینات ہُوا۔ میرے ساتھ جن دوسرے نوجوانوں نے تربیت حاصل کی تھی ان میں کچھ نے اپنا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا اور کچھ ابھی تک تگ ودو میں مصروف تھے۔ عالیہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ اُسنے کسی این آئی آر سے شادی کی۔ بیرون ملک رہنے والا کوئی امیر شخص اسے بیاہ کرلے گیا۔ اپنی مرضی کی شادی تھی سُنا کہ وہ شخص عالیہ سے عمر میں قدرے بڑا تھا لیکن کاروباری

مصرفیات کی وجہ سے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ویسے عالیہ اس رشتے سے خوش تھی کیونکہ اُسے بڑی کارپوریٹر یا کامیاب خاتون تاجر بننے کی خواہش تھی اور خواہش پوری ہونے کی یہ ایک راہ تھی۔ عالیہ ارادے کی پکی تھی۔ اورعیاش سر کے لیکچرز نے اُسکے ارادوں کو مضبوطی بخشی تھی۔ اور جبھی اُسنے اسطرح شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بھی سنا کہ گھر والے اس رشتے سے خوش نہیں تھے وہ دولہا کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں تھے اور وہ عالیہ کو اپنی نظروں سے دور ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ لیکن ہوا وہی جو ہونا تھا اور عالیہ کی جو چاہت تھی۔

وقت نے رفتار پکڑ لی اور میں سرکاری نوکری اور گھریلو مصروفیات میں اس طرح اُلجھ گیا کہ سب کچھ بھول گیا۔ پرانی یادیں پرانی باتیں۔ پرانے دوست، پرانے خواب سب کچھ۔ زندگی میں اُلجھ کے رہ گیا۔ حسب معمول میں ایک روز آفس پہنچا، میرے سامنے لوگوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ یہ ان لوگوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی جو اپنے مقدمہ کی اگلی تاریخ معلوم کرنے آتے تھے۔ ویسے ایک بات پر میں ہمیشہ حیران ہوتا تھا کہ لوگ یہ جان کر بھی کہ عدالتوں میں جا کر سالہا سال انہیں انصاف نہیں تاریخیں ملتی ہیں وہ پھر بھی کیوں عدالتوں کا رخ کرتے ہیں۔ آج بھی اس طرح کی بھیڑ تھی

لیکن میں کچھ زیادہ ہی تھکان محسوس کرر ہا تھا۔

لنچ بریک تک بھیڑ ختم ہوئی اور میں سید ھے کنٹین میں چائے پینے گیا۔ وہاں پورا کنٹین بھی کھچا کھچ بھرا تھا۔ ہر ٹیبل پر لوگ بیٹھے تھے۔ کہیں وکیل اور کہیں اسکے ایجنٹ حضرات اپنے اسامیوں کو ہوائی گھوڑوں پر سفر کرا کے اپنی جیب گرم کرر ہے تھے۔ اسی دوران میری نظر ایک ٹیبل پر پڑی جہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں اور ایک کرسی خالی تھی۔ میں سید ھے اس طرف گیا اور خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان دو خواتین میں مجھے ایک کی شکل کچھ جانی پہچانی لگی۔ لیکن کچھ یاد نہیں آر ہا تھا۔ میں نے اُسے مخاطب ہو کر پو چھا۔

''محترمہ...... اگر میں غلط نہ ہوں تو ہم شائد کہیں اسے پہلے ملے ہیں۔ مجھے یاد نہیں آر ہا ہے......''

اس عورت کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور مایوسی صاف نظر آرہی تھی، لگتا تھا جوانی میں ہی بڑھاپے نے اسکے چہرے پر ڈھیرا ڈالا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی مصیبت کی ماری ہے جبھی کورٹ آئی ہے۔ انصاف کی خاطر۔۔۔۔۔ جو یہاں نایاب ہے۔

''شاید ملے ہونگے'' اُسنے دبی زبان میں کہا۔

میں نے اپنے ذہن کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔

"کہیں آپ عالیہ تو نہیں۔ ہم نے دس دن کی تربیت ایک ساتھ حاصل کی تھی"

"ہاں۔ میں عالیہ ہوں۔تو آپ شاید..............."

اُسنے مجھے پہلے ہی نظر میں پہچانا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر مجھ سے منہ چھپانا چاہتی تھی اور بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"مگر عالیہ جی۔ یہ حال ....یہ سب کچھ ....آپ نے تو بیرون ملک شادی کی تھی۔ میں نے یہی سُنا تھا کسی رئیس سے" عالیہ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے مجھے چُپ رہنے کو کہا اور اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔اسکے ساتھ دوسری خاتون تھی وہ بول اُٹھی۔

"شادی کیا ....اسکی بربادی ہوئی۔ اِسکی زندگی تباہ کر دی۔خوابوں کو پورا کرنے کی بات کر رہی تھی اور اپنی نیند اُڑا دی، چین گنوایا، اپنا بھی اور اپنے خاندان کا بھی۔"

"جس شخص کے ساتھ عالیہ نے شادی کی اُسنے عالیہ کو دھوکا دیکر بہکا دیا تھا۔ وہ دراصل پہلے سے ہی شادی شدہ تھا اور اسکے تین بچے تھے۔ پہلے چھ مہینے عالیہ کو اُسنے اپنے گھر سے دور کسی دوسری جگہ پر رکھا۔اور جب اسکی حقیقت سامنے آگئی۔تو پتہ چلا کہ اُس شخص نے عالیہ کی معصومیت اور

نادانی کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنا ہوس پورا کیا تھا۔ جب عالیہ نے زبان کھولی تو اُس پر مصیبتوں اور عذابوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اُسے عالیہ کو مختلف اذیتیں دیدیں اور غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ دن رات وہ پردیس میں روتی رہی۔ اسکی زندگی جہنم بن گئی تھی۔ پھر بھی چار سال تک برداشت کرتی رہی اور آخر کار ہمیں بتا ہی دیا۔ جبھی ہم اسکو واپس اپنے گھر لے آئے"

وہ عورت کہتے جا رہی تھی۔

اب یہ لوگ عدالت میں اس شخص کے خلاف دھوکہ دہی کا مقدمہ دائر کرنے آئے تھے تا کہ انہیں انصاف ملے۔ میں نے انکو دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"عالیہ جی کل کس نے تمہیں مجروح کیا مت بولو لیکن اُس ماضی کو بھول جاؤ جو تمہیں پریشان کرتا ہے۔ حال کی طرف مرکوز ہو جاؤ جو تمہیں خوشی دے گا۔ ہماری زندگی میں بہت سارے رشتے سمندر پر بارش کی طرح آتے ہیں مگر ان میں کچھ ہی فائدہ مند ہوتے ہیں جیسے ایک قطرہ لعل بھی بن جاتا ہے۔ خدا بہترین سُننے والا ہے اور وہ خاموش دل کی خاموش ندا سنتا ہے۔ آپ پریشان مت ہو جایئے۔ اس میں بھی اللہ کی جانب سے اچھائی ہو گی۔"

یہ کہہ کر میں نے ان کو واپس اپنے گھر بھیجا کہ میں کسی تجربہ کار وکیل سے مشورہ کر کے انکو آگے کی کاروائی کے بارے میں بتادوں، عالیہ سے اسکا نمبر لیا اور وہ رخصت ہو گئے۔

اس روز میں رات دیر گئے تک سویا نہیں۔ عالیہ کی حالت زار پر بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ دوسرے روز اپنے ایک وکیل دوست سے اس بارے میں بات کی ''یہ مقدمہ اتنا آسان نہیں۔ دوسرے ملک میں رہنے والے شخص کیخلاف مقدمہ لڑنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اسکا کورٹ میں حاضر ہونا ہوتا ہے اور اسکو بُلانے کیلیئے سفارتی ذرائع کا استعمال ہوتا ہے۔ جو اتنا آسان نہیں'' شاید کوئی وکیل پہلی بار سچائی بتا رہا تھا۔

دوسرے دن میں نے عالیہ کو فون لگایا لیکن وہ سُوِچ آف تھا۔ دن میں چار پانچ بار میں نے کوشش کی لیکن بے سود۔ تھکا ماندہ گھر پہنچ کر آرام کیا وہاں ماریہ کو فون لگانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ جب بھی کوئی بیوی اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت سے فون لگاتے یا فون پر بات کرتے دیکھتی ہے۔ تو آسمان سر پر چڑھاتی ہے اور میں...... یہ غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز میں نے صبح سویرے نماز فجر کے بعد پرانے کاغذات میں اپنی وہ پرانی ٹریننگ سرٹیفیکیٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی جسمیں ماریہ اور

دوسرے شرکاء کا لسٹ اور ایڈرس منسلک تھا۔ آخر کار سرٹیفیکیٹ مل ہی گئی۔ خلاف معمول آج ایک آدھ گھنٹے پہلے ہی گھر سے دفتر کی طرف نکلا اور سیدھے دیے ہوئے ایڈرس پر چل کر عالیہ کے گھر کی راہ لی۔ جوں ہی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ عالیہ یہ دُنیا چھوڑ چکی تھی۔ ☆☆

تالا بند

صبح اُٹھ کر نہا دھو کر ناشتہ کرنے لگا تو اخلاق کے چاچا کمرے کے اندر داخل ہوئے

''السلام علیکم چاچا جان......''

''وعلیکم والسلام'' وہ کچھ کہے بغیر ہی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

حسین چاچا کا یہ وطیرہ دیکھ کر مجھے عجیب لگا۔

اخلاق کی جوائینٹ فیملی تھی جس میں اُس کے والدین، بیوی بچے، چاچا، چاچی، پچیرے بھائی سب اِکٹھے رہتے تھے۔ مجھے اس قسم کی فیملی از حد پسند ہے کیونکہ ہمارے ہاں اب نیوکلیر فیملی کا رواج عام ہے۔ جوں ہی

بیٹے کی شادی کی دو چار مہینے کے اندر اندر وہ علاحدہ گھر بسا لیتا ہے۔ اور تو اور بھائی کہاں شادی کے بعد بھائی کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن اخلاق کے گھر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ حسین چاچا بھی اس فیملی کا فرد تھا میں اُن سے پہلے بھی بہت بار مل چکا تھا۔ وہ کافی ہنس مکھ اور ملنسار تھے اور جب بھی اُن سے ملاقات ہوتی وہ بڑے جوش و خروش سے ملتے اور خوب خیر و عافیت پوچھتے۔ لیکن آج کچھ خلاف معمول لگ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا بات تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا، اور میں نے اخلاق سے پوچھ ہی لیا۔

''اخلاق...... یہ حُسین چاچا کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟

''ٹھیک ہی تو ہے۔ آجکل تھوڑے سنجیدہ ہو گئے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔'' اخلاق نے کہا۔

''لیکن کیوں؟''

باہر نکل کر لان میں میں نے اخلاق سے حُسین چاچا کے بارے میں پوچھا

''بات یہ ہے کہ جب پچھلے گرما میں پورے تین مہینے یہاں حالات خراب رہے۔ دکانیں وغیرہ بند تھی۔ کاروبار ٹھپ تھا۔ تو حُسین چاچا کی دکان بھی بند تھی۔ وہ ہر روز دوسرے دن کی تیاری کرتا تھا کہ دکان

پر جانا ہے۔ پورے دو مہینے وہ اس انتظار میں رہتا تھا کہ دکانیں کھلیں گیں۔ جب دکانیں نہیں کھلتیں تو ان کے ذہن پر اس کا نفی اثر پڑتا۔ وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہوئے اور کبھی خود سے باتیں کرنے لگے اور کبھی خود ہی ہنستے تھے۔ جب حالات سدھرنے لگے تو وہ دکان پر جانے کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ انہیں یقین ہی نہیں تھا، کہ دکانیں کھل گئیں ہیں۔ اور اب بھی کہتے رہتے ہیں کہ دکانوں پر کب کے تالے چڑھ گئے ہیں اور اب وہ نہیں کھلیں گیں۔ اس طرح وہ ذہنی مریض ہو گئے اب ڈاکٹروں کا علاج جاری ہے اور آج کل وہ دکان بند ہی ہے اور چاچا دن بھر گھر پر ہی..........

یہ سنکر مجھے افسوس ہوا اور.......... میری جیسے بولتی ہی بند ہو گئی۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے سوال ابھرنے لگے۔ یہی سوچتا رہا کہ کوئی اور سوال پوچھوں تو جواب اس سے زیادہ بھیانک نہ ہو۔ مناسب سمجھا جبھی چپ سادھ لی۔

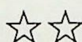
اسی دوران حُسین چاچا بھی گھر سے باہر لان میں آ گئے اور پھولوں کی ایک کیاری کی طرف چل پڑے تھوڑی دیر وہاں رُکے اور پھر واپس اندر چلے گئے۔

''اخلاق یہ حُسین چاچا وہاں کیاری کے پاس کیا کر رہے تھے؟''

"بھئی یہ اُن کا معمول ہے۔ کیا پتہ کیا کرتے ہیں؟"

میں اِخلاق کو کیاری کی طرف لیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ ماجرا کیا ہے؟ جب ہم نے کیاری کو غور سے دیکھا تو ایک سائڈ پہ ایک پتھر پایا۔ پتھر اُٹھانے پر دیکھا کہ سفید کپڑے میں کوئی چیز مٹی کے اندر رکھی ہے۔ جیسے دفن کی گئی ہو۔ کھول کے دیکھا اس میں کچھ بڑی بڑی سی چابیاں تھی۔

"ارے بھئی...... یہ تو حُسین چاچا کی دُکان کی چابیاں ہیں۔"



فیس بک

بہت سارے فرینڈز ریکیوسٹ آئے تھے اور میں دیر رات گئے بستر ے میں بیٹھ کر موبائل پر ان کو کنفرم کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ مسینجر اَپ بھی ڈاون لوڈ کیا کیونکہ کچھ مسیجز اسی میں آئی تھیں۔ ان میں کچھ جانے پہچانے لوگ تھے اور کچھ انجانے۔ دراصل میں نے پچھلے ہفتے ہی اپنے فیس بک اکاونٹ کو لائیو کیا تھا۔ ویسے اکاونٹ پچھلے کئی برسوں سے موجود تھا لیکن ایک دور دراز پہاڑی علاقے میں تبادلے کی وجہ سے اسکو چلانا بند کیا تھا۔ کیونکہ وہاں نیٹ کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

اگلے ہی روز مجھے کسی افشان کی مسیج آئی۔

''اسلام علیکم سر جی۔ آپ کیسے ہیں؟''

''واعلیکم اسلام۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ کون؟'' میں نے جواب دیا۔

''سر جی۔ آپ مجھے نہیں جانتے اور نہ ہی میں آپکو۔ میں نے آپکو فیس بک پر دیکھا تھا اور فرنڈز ریکیوسٹ بھیجی تھی۔ ویسے میرا نام افشاں ہی ہے۔''

دوسرے روز پھر اس کی میسج آئی

''ڈیئر۔ آپ کیسے ہو؟''

''ڈیئر'' یہ لفظ پڑھ کر ہی میں حیران ہوا۔ نہ جان نہ پہچان۔ اور ایک ہی دن میں......

''ٹھیک ہوں اور آپ؟'' میں نے میسج کا جواب دے دیا۔

''سر، مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ آپ کرینگے نا؟''

''مدد...... کیسی مدد''

''سر میں ایک پڑھی لکھی نوجوان لڑکی ہوں۔ گریجویشن کی ہے اور کمپیوٹر آپریشن بھی جانتی ہوں۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور گھر میں میرا بڑا بھائی اور ماں ہے۔ بھائی ایک دُکان پر چار ہزار ماہانہ اُجرت پر سیلز

مین ہے اور ماں عرصہ دراز سے بیمار ہے جسکے علاج پر ہر ماہ تین سے چار ہزار کی رقم خرچ ہوتی ہے۔ان حالات میں سر جی۔آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ گھر کا گذارہ کرنا کتنا مشکل ہے۔آپ پلیز مجھے کوئی پرائیوٹ جاب دلوا دیجئے۔تھوڑی آمدنی بڑھے گی اور گھر کا خرچہ بھی چلے گا۔پلیز سَر پلیز''

''ویسے میری نظر میں کہیں ایسا کوئی جاب نہیں۔پھر بھی میں کوشش کرونگا کہ تمہاری مدد ہو سکے۔خدا حافظ''

میرے آفس جانے کا ٹائم ہو رہا تھا۔اس لئے میں نے میسنجر آف کیا۔

دو روز بعد میں آفس میں دفتری کام میں مشغول تھا کہ پھر افشان کی مسیج آئی۔

سر۔ آئی۔ایم۔سوری آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ بہت مجبوری تھی۔ماں کی طبیعت آج صبح سے زیادہ خراب ہوگئی۔دوائی کیلئے کوئی پیسہ نہیں۔کل سے دوائی نہیں لی تھی۔ میں شرمندہ ہوں مگر مجبور بھی۔ مجھے اس وقت ایک ہزار روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ پلیز مجھے سخت ضرورت ہے اور ابھی''

''مگر مجھے کیسے پتہ چلے یہ تم جو کہہ رہی ہو وہ سچ ہے۔کیسے یقین

کروں؟

''میں سب بتاؤں گی۔ میرا اصلی نام تبسم ہے اور شہر کے پائین علاقے میں رہتی ہوں۔ ماں کی قسم یہ سچ ہے۔آپ یقین کریں یا نہ کریں ......لیکن یہ کسی کی زندگی کا سوال ہے۔میں یہ پیسے آپکو واپس لُٹادونگی۔''

یہ سمجھ کر ہوسکتا ہے وہ جو کہہ رہی ہے سچ ہو۔ میں نے اُسے اپنا اکاونٹ نمبر اور فون نمبر دینے کو کہا۔

''میرا اپنا بینک اکاونٹ نمبر نہیں ہے اور اپنا فون بھی نہیں''

میں حیران ہوا۔اور اسے میسج دیدی

''یہ کیسے ممکن ہے کہ آج کے دور میں کسی کا بینک اکاونٹ نہ ہواور نہ ہی فون ہو۔اور پھر میں پیسے کیسے بھیجوں؟

''ماں قسم۔ میرا اپنا اکاونٹ نہیں ہے۔فون بھی نہیں۔ بھائی کے پاس فون ہے اور اُسی کا اکاونٹ بھی ہے''

اُسنے اپنے بھائی کا اکاونٹ نمبر دیا اور فون نمبر بھی۔ میں نے دئے ہوئے اکاونٹ میں ایک ہزار جمع کر دیا اور افشاں کو میسج دیدی کہ میں نے پیسے جمع کر دئے۔

''تھینک یو ڈیئر۔ یہ پیسہ اُدھار ہے۔میں ضرور واپس کرونگی۔''

''پیسے لٹادونگی۔ کیسے؟ تمہارا کوئی آمدنی کوذریعہ بھی نہیں ہے''

''ڈئیر۔ وہ آپ خود دیکھیں گے''

دودن بعد پھر اسکی مسیج آئی۔

''ڈئیر۔ پھر آپ سے ہی رجوع کرنا پڑا۔ ماں کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ دو ہزار روپیہ کی سخت ضرورت ہے میں کوئی پیسہ بٹورنے والی نہیں ہوں۔ یقین کرو۔ میں ایک ایک پائی چکاؤں گی۔ ماں کی طبیعت تھوڑی سدھر جائے بس''

''میں نے پہلے بھی پوچھا تھا کہ یہ پیسے لٹانے کی بات جو کر رہی ہو وہ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ان حالات میں کیسے لٹادوگی؟''

''ڈئیر۔ تھوڑاانتظار۔ دوہزار جلدی بھیج دیجئے پلیز''

میرا شک یقین میں بدل رہا تھا۔ یہ کوئی چالو لڑکی ہوسکتی ہے جو سیدھے سادھے لوگوں کو اپنے جھانسے میں پھنسا کر پیسے جمع کرتی ہے۔ خیر اسی میں ہے اسے چھٹکارا پایا جائے۔ میں نے اس کا مسینجر ایکدم بلاک تو کردیا لیکن پورے دن آفس میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اور کسی کام میں من بھی نہیں لگا۔ اسی طرح پورا دن گزر گیا آفس ٹائم ختم ہوگیا اور سبھی ساتھی چلنے لگے لیکن میں......

''ارے یار۔ تُم ابھی بیٹھے ہو؟ گھر نہیں جانا ہے یا اور کوئی بات ہے؟'' میرے ساتھی عامر نے مجھ سے کہا؟

سَر تھامتے ہوئے میں نے کہا ''بات تو کچھ نہیں لیکن''

''لیکن..............کیا؟'' عامر نے پوچھا؟

میں نے اُسے پوری بات سنائی وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور کہا

''ارے یار تم کتنے بھولے ہو؟ عمر ہونے کو آ گئی ہے ابھی ویسے کے ویسے ہو؟ یاد ہے جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو کچھ شریر اور چالاک لڑکے یہ کہہ کر ہم جیسے سیدھے سادھے لڑکوں سے پیسے جمع کرتے تھے کہ کالج گیٹ پر ایک بوڑھی بیمار عورت ہے جسکے علاج کیلیئے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ سب جھوٹ ہوتا تھا۔ بعد میں یہ لڑکے پیسے جمع کر کے کنٹین میں پیٹ پوجا کرتے یا سنیما ہال میں کوئی فلم دیکھنے جاتے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اور یہ اُسی کی نئی ترکیب ہے۔ یا تو کسی لڑکے نے کسی فرضی لڑکی کے نام پر فیس بُک اکاونٹ کھولا ہے اور تُم جیسے سیدھے سادھے لوگوں کو بیوقوف بنا کر پیسے بٹور رہا ہے۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی آوارہ لڑکی ہو جو دو نمبر کا کام کرتی ہو..........''

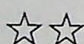
اگلے روز میں نے اُس اکاونٹ کی تفصیلات بینک سے حاصل

کیس جس میں ایک ہزار روپے جمع کیے تھے۔ اور ارادہ کیا کہ میں اصلیت پتہ کر کے بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ اتوار کو میں نے عامر کو ساتھ لیا اور حاصل شدہ ایڈرس پر پہنچے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ کچھ لوگ جمع تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

''کافی نیک عورت تھی جوانی میں ہی بیوہ ہوئی تھی لیکن دوسری شادی نہیں کی اپنے دو بچوں کو پالتی رہی پچھلے ایک دو سال سے بیمار ہی رہا کرتی تھی۔ اللہ مغفرت کرے۔''

ایک چھوٹے سے مکان کے اندر سے میت نکالی گئی جس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی سینہ کوبی کر رہی تھی اور زور زور سے چلا رہی تھی۔

''ماں مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو۔ تبسم کو بھی اپنے ساتھ لے لو ماں............''



تیرگی

رات بھر مسجدوں اور خانقاہوں میں شب خوانی ہو رہی تھی۔ لاوڈ سپیکروں سے ہر جانب درود واَذکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں اپنے گاؤں کی مسجد میں محفل شب میں شامل تھا۔ مسجد میں موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں اور بارگاہِ الٰہی میں اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگنے کیلئے ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ہر سال کی طرح اس بار بھی شب خوانی کیلئے مسجد کی انتظامیہ کمیٹی کی طرف سے پروگرام تشکیل دیا گیا تھا۔ بارہ بجے رات تک نمازیں، درود واذکار، پھر ایک وقفے کے بعد وعظ وتبلیغ، وقفے کے دوران چائے، حلوہ وغیرہ کا انتظام۔ کچھ لوگ

اس وقفے کے دوران بھی تلاوت اور اذکار میں مشغول رہنا ہی افضل سمجھتے ہیں۔

وعظ تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوا:

''یہ رات اور اسکا ذکر کلام پاک میں ہے۔ یہ وہ مقدس رات ہے جسکی فضیلت تفصیل سے بیان کی نہیں جاسکتی۔ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل اور برتر ہے۔ اگر چہ قطعی طور اس رات کی تاریخ کا علم نہیں لیکن علماء نے اس بارے میں رہنمائی کی ہے۔ یہ مسلمہ رائے ہے کہ اس ماہِ مقدس کے پچھلے دس دنوں کی طاق راتوں میں اسکو تلاش کیا جائے۔ لیکن اکثر علماء کا یہی ماننا ہے کہ ستائیس تاریخ ہی کو یہ مقدس رات ہے.........وہ لوگ صاحب ایمان ہوتے ہیں اور خوش بخت ہوتے ہیں جن کو یہ رات نصیب ہو۔ اس رات کی کچھ علامتیں اور نشانیاں ہیں جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ واقعی یہی وہ مقدس رات ہے۔ اس رات موسم بڑا سہانا اور معتدل ہوتا ہے۔ اس رات کو کتے بھونکتے نہیں کیونکہ فرشتوں کا آسمان سے نزول ہوتا ہے...........''

آج پہلی بار میں اپنے دو دوستوں عارف اور مشتاق کے بغیر ہی شب خوانی کر رہا تھا۔ میں نے دن کو ان دونوں سے اکٹھے حسب معمول

گاؤں کی مسجد میں شب خوانی کرنے کیلئے کہا تھا۔ مشتاق مان بھی گیا تھا مگر عارف نہیں مانا۔

''یار ہم ہمیشہ اپنی مسجد میں شب خوانی کرتے آئے ہیں۔ آپ بھی مان لو ہمارے ساتھ قصبے کی جامع مسجد میں شب بیداری کرو۔ وہاں لوگ بھی کافی ہوتے ہیں اور سُنا ہے کہ وہاں بہت سارے ایسے خدا دوست بندے شامل محفل ہوتے ہیں جنکی دعا اللہ کے دربار میں قبول ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہم بھی آج اس میں شامل ہو جائیں۔''

''لیکن عارف........گھر میں میری ماں اور بہن ہے وہ مجھے جانے نہیں دینگے۔ نیز علاقے کی جامع مسجد یہاں سے کافی دور ہے راستہ بھی ٹھیک نہیں اور حالات بھی........میں آپکے ساتھ نہیں آسکتا۔''

خیر سحری کے وقت سب شب خوان اپنے گھروں کو لوٹے۔ آج مجھے بھی اچھا لگ رہا تھا کیونکہ کہیں سے کتے بھونکنے کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ورنہ دور گاؤں سے بھی اگر کوئی کتا بھونکتا تو ہم ضرور سنتے۔ لیکن آج اس وقت ہر طرف خاموشی تھی۔ مسجدوں کے لاوڈ سپیکر بھی بند ہوئے تھے اور عجیب سناٹا تھا۔

سحری کھانے کے بعد مسجد میں نماز فجر ادا کر کے میں بھی اور لوگوں

کی طرح گھر آ کر سو گیا۔ ابھی نیند آنے والی ہی تھی کہ باہر سے چیخ و پکار اور شور کی آوازیں سنائی دیں۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ عارف اور مشتاق کی لہولہان لاشیں .... ''رات کے سناٹے میں وہ شہر جامع مسجد جا رہے تھے راستے میں کسی نے انکی گاڑی پر گولیاں چلائیں۔ اور دونوں وہی پر دم توڑ بیٹھے ہیں۔ وہاں کچھ کتوں کو بھی گولیاں ماردی گئی ہیں جنہوں نے شاید بھونکنا شروع کیا تھا۔''



کنفیوژن

''زندگی انجانے چیزوں سے بھری ہے۔ کبھی خوشی اور کبھی غم۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کیا ہوتا ہے۔ خلوص بھرا دل، صحیح سوچ اور مضبوط ارادے اگر یہ تمہارے پاس ہیں تو پھر تمہیں کسی چیز کا ڈر نہیں۔ تمہاری پیٹھ پیچھے تمہاری بات کرنے والوں کی پرواہ نہ کر۔ اُن کے اس رویئے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ تمہاری سطح تک نہیں پہنچ پاتے یا ان کے پاس وہ نہیں جو تمہارے پاس ہے۔ ورنہ وہ تمہاری نقل کرنا چاہتے ہیں کر نہیں پاتے۔ یار تم اپنے فیصلہ پر ایک بار پھر غور کرلو کہیں تم جذبات میں کوئی غلط قدم تو نہیں اُٹھا رہے ہو۔''

میں اقبال کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی کہ وہ ذہنی اور شعوری اعتبار سے پختہ ہے اور پچھلے بیس سال سے ہم ایک ہی ادارے میں کام کر رہے تھے۔ اور ہماری کافی نزدیکیاں تھیں۔ کبھی میرا کوئی

مسلہ ہوتا تو اسکا مشورہ یقیناً سود مند ہوتا اور ادارے کے سبھی لوگ، اُسکے دوست احباب، گھر والے اور رشتہ دار اور اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اسکے مشوروں سے مستفید ہوتے تھے۔لیکن آج مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار ایک غلط فیصلہ لے رہا ہے۔

''بھئی۔ میرا یہ فیصلہ حتمی ہے۔اگر غلط ثابت بھی ہوتا ہے تو ایک نیا تجربہ حاصل ہوگا اور اگر صحیح ثابت ہوا تو میری کامیابی۔دونوں صورتوں میں مجھے خوشی ملے گی۔''

اقبال اپنے فیصلے پر بضد تھا اور میں یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے کیسے فیصلہ بدلنے پر آمادہ کروں۔

اقبال کی زندگی میں بڑے اُتار چڑھاؤ آئے تھے اور اُسنے سبھی کا مقابلہ بڑی سوجھ بوجھ اور ہمت سے کیا تھا۔ اوروں کیلئے وہ مثال بن گیا تھا۔ادارے میں اسکی بڑی خاص عزت تھی۔ ویسے وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ اس نے ادارے کی ترقی اور اسکے پھیلاؤ، کام کاج کیلئے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ وہ اُن دنوں ریاست کے ایک دُور اُفتادہ علاقے میں جسکا رابطہ دیگر علاقوں سے سال میں چھ ماہ کٹ کر رہ جاتا ہے تعینات تھا جب اسکے والد کا انتقال ہوا تھا تو نہ وہ اسکے جنازے اور نہ ہی تجہیز و تکفین میں شامل ہو سکا تھا۔ اسی

طرح اسکی ننھی بیٹی بھی اچانک فوت ہوئی جب وہ اور ایک ایسی جگہ تعینات
تھا جہاں سے گھر آنے میں اُسے چار دن لگ گئے۔ اسکا چہرہ بھی نہ دیکھ
پایا۔لیکن ان واقعات سے ادارے کے تعین اسکے لگاؤ اور دلچسپی میں کوئی کمی
نہیں آئی۔ اسکا ماننا تھا کہ وہ جو کچھ بھی ہے اسی ادارے کے طفیل ہے اور اسی
ادارے نے اسکو ایک نام اور پہچان دی ہے۔ وہ اپنی محنت اور لگن سے آگے
بڑھتا گیا۔ اور اسی دوران ایک بار کچھ ایسا ہوا جس نے اسکی زندگی کی چلتی
گاڑی پر روک لگا دی اور وہ ایکدم بدل گیا۔ ادارے میں ترقیاں دینے کا
سلسلہ شروع ہوا اور اسکو بھی انٹرویو کیلیئے بلایا گیا۔ وہ خوش تھا اور پُر امید
بھی۔ لیکن جب لسٹ نکلا تو اسکا نام لِسٹ میں نہیں تھا۔ وہ مایوس ہوا لیکن
فیصلۂ ازل مان کے تسلیم کر لیا۔ چند ماہ بعد اسکی پوسٹنگ ایک ایسے آفس
میں کی گئی جہاں اُسے اپنے ایک جونیر کے تحت کام کرنا تھا۔ اور یہی سے
اسکی سوچ پختہ ہوگئی۔ اور قبل از رٹیائرمنٹ نوکری چھوڑنے کے مطلق سوچنے
لگا اور اب اپنے والنٹری ریٹائرمنٹ لینے کا فیصلہ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ صحیح تھا
لیکن ایسے اداروں میں ان باتوں پر نوکری چھوڑنا میرے خیال میں ٹھیک
نہیں کیونکہ اس سے ادارے کی صحت اور انتظامیہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا
ہے۔

چندروز بعد اقبال نے اپنی VRS درخواست ہیڈ آفس کو بھیجدی اور وہاں سے ایک پری وی۔آر۔ایس سوالنامہ اُسے بھیجا گیا۔اقبال نے مجھے وہ دکھایا۔ میں خوش ہوا کہ انتظامیہ نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ اقبال جیسا سینیر آفیسر قبل از وقت سبکدوش کیوں ہورہا ہے۔ مجھے تھوڑی سی خوشی اور اطمینان ہوا کہ اقبال کا وی۔آر۔ایس منظور نہیں ہوا ہے کیونکہ پہلی بار کسی وی۔آر۔ایس لینے والے سے اسطرح پوچھا گیا تھا۔اقبال کو میں نے یہ سوالنامہ فوراً پُر کرنے کو کہا اور جب آفس کے سبھی لوگ نکل گئے اُسنے میرے سامنے یہ پُر کیا۔

☆ کیا آپ بخوشی نوکری چھوڑرہے ہیں؟

نہیں

☆ آپ کیوں نوکری چھوڑرہے ہیں؟

ادارے میں ترقیاتی عمل صاف شفاف نہیں

☆ کیا آپ کو دوسری جگہ نوکری کرنی ہے؟

نہیں

☆ اگر آپکی شکایت دور کی جائے تو کیا آپ نوکری نہیں چھوڑینگے؟

ہاں

ایسے ہی کچھ اور سوالات تھے۔اقبال جب صبح آیا تو میں نے سب سے پہلے اسے یہ سوالنامہ ہیڈ آفس بھیجنے کو کہا اور معلوم ہوا اسنے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ میں نے ہیڈ آفس اپنے ایک ساتھی سے اس بارے میں پوچھا تو اسنے بتایا اگر ایسا ہی جواب دیا تو وی۔آر۔ایس نا منظور ہوگا۔اور وہ ادارے میں ہی رہے گا۔

ایک ہفتے بعد اقبال کو ہیڈ آفس سے چھٹی آئی جسمیں لکھا تھا کہ آپکا وی۔آر۔ایس ہیڈ آفس کو ملا اور اسکو مدّ نظر رکھ کر آپکا وی۔آر۔ایس منظور کیا جاتا ہے۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔میں نے ایکدم ہیڈ آفس اپنے اس ساتھی سے اس بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وقار نے جو سوالنامہ میرے ساتھ بھرا تھا وہ بھیجا نہیں تھا بلکہ دوسرا سوالنامہ جسمیں سب سوالوں کے جواب الٹے تھے۔میں حیران تھا اور۔۔۔۔اقبال بڑے اطمینان سے آفس سے نکل رہا تھا۔اُس کے چہرے پر عجیب قسم کی چمک نمایاں تھی۔



شناخت

جب سے ہم اس کالونی میں رہنے لگے تھے تب سے ہم نے اپنی زندگی میں آرام محسوس کیا تھا۔ کسی سے نہ لینا نہ دینا، کسی کے ہاں نہ جانا اور نہ کسی کا ہمارے ہاں آنا۔ بیگم صحیح کہتی تھی کہ گاؤں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ بے در و دیوار و صحن ۔گھروں کے کُھلے ہوئے دروازے، ہر دم ہمسایوں کا آنا جانا۔ آرام کی کوئی گھڑی نصیب نہیں ہوتی، اور تو اور اپنی پرسنل لائف بھی ڈسٹرب ہوتی ہے اور گھر کے راز تو راز نہیں رہتے ۔ان معاملات میں میری بیگم مجھ سے زیادہ حساس تھی، وہ تو شہر کی رہنے والی تھی اور میں گاؤں کا، یہی تو فرق تھا۔

کل میں حسب معمول جب آفس کے لئے نکلا تو باہر سڑک کے آر پار تار بچھائی گئی تھی ۔رات کو ہی سرکار کی طرف سے بندشوں کا اعلان ہوا تھا۔ٹریفک پر مکمل پابندی تھی، چونکہ مجھے آفس میں ایک اہم میٹنگ میں شامل ہونا تھا لہذا میں چل پڑا۔

"رکو! کہاں سے آئے ہو، کہاں جانا ہے؟" سڑک پر وردی میں

ملبوس فرد نے پوچھا

''میں اسی کالونی میں رہتا ہوں اور آفس جانا ہے''

''تمہیں معلوم نہیں، آج بندشیں ہیں، جاؤ اندر بیٹھو''

میں نے اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مجھے آفس ضروری پہنچنا ہے اور اس طرح بحث میں اُلجھ گیا۔ اس پر اُسے غصہ آیا اور مجھ سے کہا

''کھڑے رہو ادھر، شور مت کرو، ورنہ۔۔۔۔''

اسی دوران ایک نزدیکی مکان کی کھڑکی سے کسی نے سر باہر نکالا اور مجھے دیکھنے لگا

وردی پوش شخص نے اُس سے پوچھا ''آپ اس کو جانتے ہو؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا

وردی پوش نے پھر مجھ سے پوچھا ''تم اس کو جانتے ہو؟''

میں نے بھی انکار میں سر ہلا

''نہ یہ تمہیں جانتا ہے اور نہ تم نہ اس کو، اور کہتے ہو اسی کالونی کا رہنے والا ہوں، رکو، گاڑی آنے دو، تمہیں تازہ ہوا کھلائینگے''



مصوِر

''اجی۔۔۔ذرا باہر نکلو، کھڑکی سے جھانکو تو'' افشانہ سہمی ہوئی تھی

میں واش روم سے جلدی نکلا اور پوچھا ''خیریت۔۔۔؟''

''خود ہی باہر کھڑکی سے جھانکو۔ پورا بازار بند ہے، کہیں بھی کوئی دکان کھلی نظر نہیں آتی، کہیں کوئی ہڑتال یا بند تو نہیں ہے، دن کے گیارہ بھی بج چکے لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔۔۔''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، سچ میں ساری دکانیں بند تھیں، صرف اکاڈکا گاڑیاں چلتی نظر آرہی تھیں، یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ بات کیا تھی میں روم سے نکل کر ہوٹل کے ریسپشن پر گیا اور منیجر سے پوچھا

''منیجر صاحب۔۔۔باہر سبھی دکانیں بند ہیں، کیا کوئی بند وغیرہ ہے؟''

ہوٹل منیجر مسکرا کر بولا ''جناب، کوئی بند وغیرہ نہیں، یہاں دُکانیں

بارہ بجے کے بعد ہی کھلتی ہیں اور رات دیر گئے بند ہوتی ہیں۔ یہ حیدرآباد ہے جناب، نوابوں کا شہر، اگرچہ آزادی کے بعد نہ یہ نواب رہے اور نہ ان کی نوابی مگر عام لوگوں کی عادتیں وہی رہیں۔ نوابی دور کی طرح ہی اب بھی یہ لوگ دیر سے سوتے ہیں اور دیر سے جاگتے ہیں۔ تب تو رات دیر گئے تک محفلیں سجتی تھیں، اب محفلیں نہیں سجتیں لیکن دیر سے سونے جاگنے کی عادت نہیں چھوٹی......"

میں نے اطمینان کی سانس لی اور واپس اپنے روم میں چلا آیا اور افشانہ کو بازار بند ہونے کی وجہ بتادی۔ اس نے بھی چین کی سانس لی اور بولی

"میں ڈرگئی تھی کہ کہیں ہڑتال نے یہاں بھی ہمارا پیچھا تو نہیں کیا مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ یہاں کا معمول ہے"

ہماری شادی کو دس سال بیت چکے تھے اور آج پہلے بار ہم گھر سے باہر کہیں دور گھومنے نکلے تھے۔ شادی ہونے کے فوراً بعد ہمارے علاقے میں حالات اتنے زیادہ خراب ہو گئے تھے کہ گھر سے باہر قدم رکھنا بھی مشکل ہو گیا تھا، روز روز کرفیو، کریک ڈاون، چھاپے، ہڑتال، مار دھاڑ، ٹیرگیس، پتھراؤ، مظاہرے، گرفتاریاں اور ہلاکتیں۔ پتہ نہیں چلا یہ دس سال

کیسے گذرے، پچھلے سال سے میں اس کوشش میں تھا اور چاہت بھی تھی کہ کچھ وقت نکال کے کہیں دور جا کر آرام سے کچھ دن گزاریں۔ ہم نے پھر بھی شادی سے پہلے اچھے دن دیکھے تھے لیکن ہمارے دو بچوں نے تو پیدا ہونے سے اب تک گھر سے باہر سکول کے بغیر کچھ نہیں دیکھا تھا۔ پچھلی سنیچر کو جب میں آفس سے گھر پہنچا تو افشانہ کو بتایا کہ کیوں نہ دس پندرہ دنوں کے لئے حیدر آباد گھومنے جائیں۔ اس گھٹن بھرے ماحول سے نکل کر آرام کے کچھ لمحات گزاریں اور بچوں کو باہری دنیا بھی دکھائیں۔ وہ ذہنی طور اس کے لئے تیار نہیں تھی کیونکہ وہ گھر کے امور کے ساتھ حد سے زیادہ اُلجھ گئی تھی صبح سویرے اُٹھنا، چائے ناشتہ تیار کرنا، صفائی ستھرائی کرنا، بچوں کو سکول کیلئے تیار کرنا اور پھر خود تیار ہو کر ڈیوٹی پر جانا، ڈیوٹی سے واپس آ کر پھر گھر کا کام اور بچوں کو پڑھانا اور ہوم ورک کرانا، یہی اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ گھریلو معاملات میں اس طرح اُلجھ گئی تھی کہ اُسے باہری دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور ایک بات تھی کہ وہ ہمیشہ میری خوشی میں اپنی خوشی دیکھا کرتی تھی جبھی میرے اِصرار وہ حیدر آباد جانے کے لئے تیار ہوئی۔

"اب موڈ ٹھیک ہوا، گھر کی باتیں گھر پر چھوڑو اور فی الحال یہاں کا لطف اُٹھاؤ اور بھول جاؤ سب کچھ...... جلدی جلدی تیار ہو جاؤ اور بچوں کو

بھی تیار کرلو۔ آج ہم چار مینار، مکہ مسجد اور سالار جنگ میوزیم دیکھنے جائینگے، کل کا پورا دن گولکنڈہ ٹاور اور پرسوں فلم سٹی'' میں نے افشانہ سے کہا

پورا دن ہم گھومتے رہے اور کھلی فضا میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے رہے۔ مکہ مسجد میں ہم تھوڑی دیر سنگ مرمر کی ایک سیٹ پر بیٹھے اور پھر پتہ چلا کہ جو بھی اس پتھر پر ایک بار بیٹھتا ہے، اسے دوبارہ یہاں آنا پڑتا ہے۔ خدا جانے یہ سچ تھا کہ جھوٹ۔ مشکل سے لنچ کے لئے وقت نکالا کیونکہ یہ جگہیں اتنی پُرکشش تھیں کہ یہاں سے نکلنے کا من ہی نہیں کرتا، خاص کر سالار جنگ میوزیم جہاں راجوں اور نوابوں کی بیش بہا نوادرات محفوظ رکھی گئی ہیں۔ بچوں کو بھی یہ جگہ بہت پسند آئی اور ان کے لئے دلچسپی کی خاص وجہ میوزیم کے مین گیٹ پر لمبے سفید بالوں والا وہ شخص تھا جس کے ہاتھوں میں پنسل اور کاغذ کے چند سادہ اوراق تھے۔ کسی بھی شخص پر ایک نظر ڈال کر وہ پنسل سے کاغذ شیٹ پر اس کی تصویر بناتا تھا وہ بھی صرف پچاس روپے میں۔ دونوں بچوں نے اپنی اپنی تصویریں بنوائیں اور افشانہ نے بھی میرے ساتھ ایک تصویر بنوائی۔ یہ تصویریں کیمرہ سے لی جانے والے فوٹوز جیسی ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم شام کو تھکے ہارے جب واپس ہوٹل پہنچے تو اسی مصوِر کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ خدا نے

اسے کیسے سنہری ہاتھوں سے نوازا تھا۔ یہ تو کمال ہے۔ بچوں کی بھی اپنی تصویریں دیکھتے دیکھتے آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح ہم ذرا دیر سے ہی اُٹھے۔ایک تو گزرے دن کی تھکان اور دوسرے حیدرآباد کے ماحول کا اثر۔صبح جلدی اُٹھ کر بھی کیا کرتے۔ چائے ناشتہ کر کے ہم گولکنڈہ ٹاور دیکھنے کے لئے تیار ہوئے۔ابھی ہم ہوٹل سے تھوڑی دوری تک پیدل ہی چلے تھے کہ سامنے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا۔

افشانہ تھوڑی سہمی اور میرا بھی دل زور زور سے دھڑکنے لگا

''بھائی صاحب۔ یہ اتنے سارے لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں؟''

میں ے ایک شخص سے پوچھا

''ابھی ایک راہگیر کسی گاڑی سے ٹکرایا ہے اور گہری چوٹ لگنے سے وہیں پر دم توڑ بیٹھا ہے۔اب پولیس فوٹوگرافر کا انتظار کر رہی ہے تا کہ شاخت ہو سکے کہ یہ شخص کون ہے''اُس نے بُری خبر سنائی

میں لاش دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ کیا....خون میں لت پت مصوِر................!!!!

☆☆

تعبیر

جاڑے کا موسم اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا اور بہار کی آمد آمد کے ساتھ ہر طرف ہریالی نظر آنے لگی تھی۔ لوگ مسجدوں کے حماموں اور اپنے گھروں سے اب باہر نکل کر بازاروں، کھیتوں، کھلیاروں میں اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ بڑا پُر کشش اور دلفریب منظر تھا۔ فضا میں مہک اور لوگوں کے چہروں پر خوشی تھی جیسے نئی زندگی کے آثار۔ ہر طرف شادمانی، دُکاندار دکانوں پر، کاشتکار کھیتوں میں، ملازم اپنے دفتروں میں، مزدور اپنے کارخانوں میں اور بچے اپنے اسکولوں میں۔ سب اپنے اپنے کام میں مشغول۔ اچانک دور سے اُڑتی ہوئی دھول نظر آئی۔

''سرخ آندھی آرہی ہے۔'' کوئی زور سے چلایا، سب ہکے بکے رہ گئے

''ہاں۔ یہ تو سرخ آندھی ہے اور اس کا رخ بھی ہماری طرف

ہے" ہوشیار خبردار، ہر طرف چیخ و پکار تھی، سرخ آندھی نے ہر طرف گھیر لیا تھا اور اس میں سے بے شمار بھڑیں نکل آئیں اور انہوں نے سب کو ڈسنا شروع کیا، وہ جس کو ڈستے وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا۔ لوگ بکھر گئے، کچھ ڈر کے مارے بھاگ گئے، کچھ لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ان سنی کی، جن کی آنکھیں کھلی تھیں وہ بینائی سے محروم ہو گئے۔ ہاتھ بے حس اور زبانیں گنگ ہو گئیں۔ پانی لہو لہو ہو گیا۔ لاشوں کے انبار لگ گئے، بے حس و حرکت لوگوں کے کارواں ہر طرف۔ مائیں سینہ کوبی کر رہی تھیں اور اپنے لخت جگر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ پلک جھپکتے سب بدل گیا۔ احساس منجمد اور جذبات....... قیامت کا منظر... ایک بھڑ میری طرف بھی آنے لگی جونہی اس نے میرے ماتھے پر ڈس لیا، میں چیخ پڑا اور اسی کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے خوفناک خواب دیکھا تھا، میں پسینے میں شرابور تھا اور میرے اندر خوف کے آثار موجزن تھے۔ خدا جانے اس کی تعبیر کیا ہو گی، باہر دھیمی دھیمی روشنی پھیل رہی تھی، بستر چھوڑ کر میں نے جوں ہی کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ وردی پوش سڑک کے دونوں طرف استادہ تھے۔ اچانک ان میں نے ایک وردی پوش نے ایک پتھر اُٹھا کر میری کھڑکی کی جانب پھینکا جو سیدھے میرے ماتھے پر آ لگا۔۔ اور۔۔ میں لہولہان ہو گیا۔☆☆

لکیر

کرائے کے اس گھر میں پہلی منزل میں مالکِ مکان اور دوسری منزل میں، میں رہتا تھا۔ مالکِ مکان صفدر علی، ایک ریٹائرڈ اُستاد مطالعے کا بے حد شوقین تھا۔ اُس کا گھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا اور میں بھی اپنے فری ٹائم کو اُس سے کوئی کتاب لیکر پڑھنے میں صرَف کرتا۔ تواریخ اور مذہب کی بیش بہا اور کچھ انمول کتابیں اُس کے پاس موجود تھیں ۔ اس سرحدی علاقے میں صفدر صاحب کو سب لوگ عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے اور انہیں اپنے علاقے کا صاحبِ علم شخص گردانتے۔ مجھے بھی ان سے کئی بار گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ لمبا قد، سفید بال، صاف وشفاف چہرہ، نہ داڑھی

نہ مونچھیں، صفدر صاحب ہمیشہ سنجیدگی اور غور وفکر میں نظر آتے، ایک بار جب میں نے اُن سے اِس کی وجہ پوچھی تو اُنہوں نے کہا

"ہمارے گھر میں ہمیشہ خاموشی ہی چھائی رہتی ہے کیونکہ اس گھر میں ہم میاں بیوی کے بغیر کوئی نہیں رہتا۔ بیٹی اپنے سُسرال میں ہے، بیٹا اپنی بیگم کے ساتھ امریکہ میں..... اب بات کریں بھی تو کس کے ساتھ، رشتہ دار تقسیم ہند کے وقت سرحد کے اُس پار کے ہوگئے اور ہم اس پار کے۔"

لیکن... چار مہینے کے بعد میں نے صفدر صاحب کے گھر کا ماحول ہی بدلا ہوا پایا، بچوں کا شور، بڑوں کا ہنسنا اور خود صفدر صاحب کے چہرے پر ایک نمایاں سی مسکراہٹ۔ معلوم ہوا کہ اُن کے گھر سرحد کے اُس پار رہنے والے کچھ رشتہ دار آئے ہیں۔ یوں اُن کے گھر میں یہ رونق کئی دنوں تک رہی۔ میں بھی ان دنوں اُن کے ساتھ کافی گھل مل گیا خاص کر اُن میں شامل ایک نیلی آنکھوں والی، سنہری بالوں والی خوبصورت بچی کے ساتھ جسے وہ سب گڈی کہہ کے پکارتے تھے، میں بازار سے لوٹتے ہوئے اکثر اُس کے لئے ملک چاکلیٹ بھی لانے لگا تھا، پہلے پہلے وہ لینے سے ہچکچاتی رہی لیکن پھر مجھ سے مانوس ہوتی چلی گئی۔

کچھ دنوں بعد یہ مہمان سرحد کے اُس پار اپنے گھر کی جانب روانہ ہونے لگے تو صفدر صاحب، اُن کی بیگم اور میں اُنہیں سرحد تک چھوڑنے کے لئے نکلے۔ سرحد کے دونوں طرف حفاظتی دستے مستعدی سے کھڑے تھے۔ کئی منٹوں تک وہ اُس طرف اور ہم اس طرف ایک دوسرے کو تر آنکھوں سے تکتے رہے۔ میری نظریں گڈی پہ مرکوز تھیں۔ وہ زیر لب کچھ کہہ رہی تھی، اچانک میرا ہاتھ اپنی جیب کی طرف چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھ میں ملک چاکلیٹ تھا۔ گڈی میری جانب بڑھنے لگی کہ اچانک اُسے اپنے باپ نے روکا۔ وہ اب میری جانب آ ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ بیچ میں.......

...... لکیر اپنا منہ پھیلائے کھڑی تھی۔ ☆☆

Aaday Adhooray Log

Dr. M. Shafi Ayaz

مصنف کی دیگر تصنیفات:

☆ دردِ پنہاں (اردو افسانوی مجموعہ)

☆ پگڈنڈی کا مسافر (اردو افسانوی مجموعہ)

☆ فیصلہ ابھی باقی ہے (اردو افسانوی مجموعہ)

☆ تلاشِ سحر (اردو شعری مجموعہ)

☆ شبِ تنہائی (اردو شعری مجموعہ)

☆ تم یاد کرو گے (اردو شعری مجموعہ)

☆ برستے ہی نہیں بادل (اردو شعری مجموعہ)

☆ شام ہونے لگی (اردو شعری مجموعہ)

☆ اسلامی بنکینگ (انگریزی مقالہ)

☆ پوت ژھاے (کشمیری شعری مجموعہ)

☆ ہدیہِ عقیدت (کشمیری نعتیہ مجموعہ)

